جشن آزادی مبارک
تعلیم و تربیت
اگست 2017
اُڑان
صفحہ نمبر 04
آلو ماسٹر
صفحہ نمبر 07
نیلی چڑیاں
صفحہ نمبر 57
جب پاکستان بنا
صفحہ نمبر 14

اگست 2017ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو اور عزیز ساتھیو!

کہیے، کیسے ہیں آپ؟ گرمیوں کی چھٹیاں خوب مزے سے گزار رہے ہوں گے اور دوسرے مشاغل سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ ایسا ہی ہے نا؟

آپ اور ہم ہر سال یوم آزادی بہت جوش و خروش سے مناتے ہیں، سبز ہلالی پرچم اور رنگ برنگ جھنڈیوں، قمقموں سے گھروں کو سجاتے ہیں۔ پورا وطن دل دل پاکستان پکار رہا ہوتا ہے، ہر چمکتا دمکتا چہرہ گنگناتا ہے۔ ”اے وطن! تو سلامت رہے، تا قیامت رہے۔“

زندہ قومیں ایسے ہی جوش و خروش سے آزادی کا دن مناتی ہیں۔ یاد کیجیے کہ پچھلے سال ہم نے اپنے وطن کی خوش حالی کے لیے کیا کیا؟؟ ہم سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی۔ ہم نے اپنے ملک کی املاک کو نقصان تو نہیں پہنچایا، کہیں ہم نے اپنی گلیوں، سڑکوں، پارکوں میں گندگی تو نہیں پھیلائی۔ یاد کیجیے ہم نے کہیں ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی تو نہیں کی۔

پیارے بچو! اچھے مسلمان اور پاکستانی کی حیثیت سے اپنے وطن کی ترقی اور خوش حالی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جاؤ۔ قدر کرو اپنی آزادی کی، حفاظت کرو اپنی ملک کی سرحدوں کی۔ یہ وطن آزاد ہے تو یوں ہی نہیں حاصل ہوا۔ لاکھوں قربانیوں کے بعد ہمیں یہ وطن ملا ہے۔ سلام پیش کیجیے، ان بہادروں اور باہمت انسانوں کو جنھوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ فاتحہ پڑھیے ان سب کے لیے ان رہ نماؤں، ان نمازیوں اور شہیدوں کو سلام جنھوں نے اندھیری شب کو سویروں میں ڈھالا۔

دل چسپی اور لگن سے علم حاصل کریں اور ہمہ دم اس وطن کے ذرے ذرے کو چمکائیں۔ کیوں کہ یہ وطن ہمارا ہے، اسے ہم نے ہی سنوارنا ہے۔

آخر میں آپ کو سب کو جشن آزادی مبارک ہو۔ دعا ہے کہ ہم تا قیامت اپنے پیارے وطن کا یوم آزادی جوش ولولے سے مناتے رہیں۔ آمین! ثمہ آمین!

اس شمارے میں

سرورق: جشن آزادی

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔
مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمد باری تعالیٰ

کوئی مسلم ہے یا کافر سب کا ہے روزی رساں
اے مرے معبودِ برحق سب پہ ہے تو مہرباں
سب کا خالق سب کا مالک سب کا پالن ہار ہے
تیرے ہی زیرِ تسلط ہیں زمین و آسماں
دونوں عالم سے ہویدا ہے ترا رعب و جلال
تیری عظمت کی نشانی ہیں مکان و لا مکاں
تیری ذات پاک کو نہ نیند ہے نہ اونگھ ہے
کرتے ہیں تیری عبادت ہر گھڑی کرّو بیاں
ہے تیری صفتِ مبارک الحفیظ و الحفیظ
تو عطا کرتا ہے سب مخلوق کو حفظ و اماں
بخش دے مجھ کو بھی اِذنِ حاضری پروردگار
لوگ جائیں تیرے در پر کارواں در کارواں
جھک گیا تیرے درِ اقدس پہ جس انساں کا سر
وہ ہوا دونوں جہاں میں کام یاب و کامراں

روزی رساں: روزی دینے والا — کرّو بیاں: فرشتے
ہویدا: ظاہر — اِذن: منظوری
زیرِ تسلط: قبضے میں

نعت رسولِ مقبول ﷺ

کرم فرما ، ہمیں طوفانِ عصیاں سے نکال آقاؐ
ہمیں ایمان کی دولت سے کر دیں مالا مال آقاؐ
ستارہ اپنی قسمت کا بلندی پر پہنچ جائے
نگاہِ التفات ہم پر بھی ہو مثلِ بلالؓ آقاؐ
ہمیں مل جائے ان سے بھی نجات اے سیدِ کونینؐ
ہمیں گھیرے ہوئے ہیں آج بھی حزن و ملال آقاؐ
دہر میں کس قدر چرچے تھے پہلے حسنِ یوسفؑ کے
نہیں ملتا کہیں اب آپؐ سا حسن و جمال آقاؐ
عطا ہو جائیں ہم کو عظمتِ رفتہ کی وہ گھڑیاں
کہ جن میں تھا مثالی قوم کا رعب و جلال آقاؐ
یقینی بات ہے اس میں نہیں شک و شبہ کوئی
جہاں میں آپؐ کی ہستی ہے بے مثل و مثال آقاؐ
بڑی مشکل سے ملتا ہے ابھی جیون کی راہوں پہ
قمر کو غم کے چرکوں نے کیا اتنا نڈھال آقاؐ

ریاض حسین قمر

عصیاں: گناہ — دہر: دُنیا
حزن و ملال: دکھ اور ندامت — چرکہ: زخم

وقت کی قدر و قیمت

پیارے بچو! ''وقت'' ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کو درست استعمال کیا جائے۔ وقت کا درست استعمال یہ ہے کہ ہمارا وقت کسی ایسی سرگرمی یا عمل میں صرف ہو جو ہمیں مستقبل میں نفع دے۔ موجودہ وقت ہمارے پاس غنیمت ہے، اگر ہم نے آج اس سے فائدہ اُٹھا لیا تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ کل اس کا بہترین صلہ اور اجر ملے گا۔ اور اگر ہم وقت کی قدر نہ کر سکے اور فضولیات میں مبتلا ہوگئے یا گناہوں سے لذت لینے لگے تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گیا وقت ہاتھ نہیں آتا، پھر حسرت اور پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے، کاش! میں یوں کر لیتا، کاش! میں یوں کر لیتا۔

آیئے! جانتے ہیں کہ قرآن اور احادیث میں ہمیں وقت کی قدر و قیمت کا احساس کس طرح دلایا گیا ہے۔

قرآن پاک میں زمانے اور دن رات کی قسم کے ساتھ مختلف اوقات کی قسمیں بھی ملتی ہیں، کہیں صبح کی، کہیں ضحیٰ (چاشت کے وقت کی)، کہیں عصر کے وقت کی۔ ان قسموں کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ہمیں پکار پکار کر وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلایا گیا ہے، پل پل، لمحہ لمحہ تول تول کر خرچ کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اگر ہم قرآن وسنت میں دیئے گئے احکام کی طرف غور کریں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل اور حکم کی بجا آوری کے لیے ایک معین وقت ہے۔ ہر نماز اپنے اپنے وقت میں ادا کی جاتی ہے۔ روزے سال کے ایک خاص مہینہ ''رمضان'' میں فرض ہیں۔ زکوٰۃ کا فریضہ معین مدت گزرنے پر ذمہ میں آتا ہے۔ حج کے لیے سال بھر میں مخصوص ایام ہوتے ہیں۔ پس دین کے اکثر احکام وقت کے نظم وضبط کے ایک خاص نظام کے پابند ہیں، اس میں جہاں ایک طرف فریضہ کو بروقت ادا کرنا مطلوب ہے تو وہاں وقت اور اس میں نظم وضبط کی اہمیت کو اُجاگر کرنا بھی مقصود ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو: (1) اپنی موت سے پہلے اپنی زندگی کو۔ (2) اپنی بیماری سے پہلے اپنی تندرستی کو۔ (3) اپنی مشغولیت سے پہلے اپنی فراغت کی گھڑی کو۔ (4) اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی کو۔ (5) اپنے فقر سے پہلے اپنی مال داری کو۔ (مستدرک حاکم، کتاب الرقاق:7846)

معلوم ہوا کہ وقت بڑی قیمتی دولت ہے، اس سے جو فائدہ اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو، آج فراغت ہے کل اپنے ساتھ بے شمار مشغولیتیں لائے گی، آج صحت ہے کل نا معلوم کس بیماری کا شکار ہو جاؤ، آج زندگی کے مزے لوٹ رہے ہو کل خاک اوڑھے قبر میں پڑے ہو گے، آج تنومند جوان ہو، قوت اور طاقت ہے کل بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاؤ گے سب قوتیں زائل ہو جائیں گی، ضعف چھا جائے گا، ہلنے جلنے میں دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے۔ آج صاحب حیثیت ہو کل نا معلوم یہ حیثیت رہے یا نہ رہے۔

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر روز صبح کو جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس وقت دن یہ اعلان کرتا ہے: آج اگر کوئی بھلائی کر سکتا ہے تو کر لے، آج کے بعد میں پھر کبھی واپس نہیں لوٹوں گا۔'' (شعب الایمان، الصیام 366/5)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر آنے والا دن اپنی قیمت کا احساس دلاتا ہے، کوئی تو اس کو قیمتی بنا لیتا ہے اور کوئی بلبلے کی طرح ہوا میں اُڑا دیتا ہے۔

پیارے بچو! آج ہم غفلت کا شکار ہو کر وقت جیسی قیمتی دولت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر آپ دین و دنیا میں کام یاب ہونا چاہتے ہیں، تو وقت کی قدر کریں، کیوں کہ جو قومیں وقت کو ضائع کر دیتی ہیں وقت اُنھیں ضائع کر دیتا ہے۔ ☆☆☆

ٹرائے نے جب آنکھ کھولی تو اس نے خود کو اپنی ماں کے نرم، گرم پروں کے درمیان پایا۔ وہ اس دنیا کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیا تو کیا...... وہ تو اپنے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اس دنیا میں اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ ابھی تو اسے بس بھوک کا احساس ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کی ماں اپنی چونچ کی مدد سے اسے کھانا کھلا دیتی تھی۔ یا پھر باقی کے اوقات میں وہ سویا رہتا تھا۔ پہلے پہل وہ گوشت کی ایک ننھی سی بوٹی جیسا تھا۔ پھر سبز رنگ کے کومل پر اس کے جسم کو ڈھانپنے لگے۔ اب وہ تھوڑا چل پھر بھی لیتا تھا۔ وہ جہاں موجود تھا۔ یہ ایک تنگ سی جگہ تھی۔ سامنے کے رخ گھر میں آنے جانے کے لیے ایک چھوٹا سا گول سوراخ بھی موجود تھا۔ وہ ہمیشہ اس سوراخ کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سوراخ میں سے باہر جھانک کر دیکھے مگر اس کی ماں نے اسے ایسا کرنے سے روک رکھا تھا۔ پھر ایک دن تجسس سے مجبور ہو کر وہ اس سوراخ کی طرف بڑھا۔ سامنے کے رخ تو اسے بس نیلا آسمان نظر آتا تھا۔ نیچے کیا ہے؟ وہ بس یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اب اس نے ڈرتے ڈرتے سوراخ سے باہر جھانکا۔ پھر خوف کی وجہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ سہم کو پیچھے چاہتا تھا۔ اب اس نے ڈرتے ڈرتے سوراخ سے باہر جھانکا۔ پھر خوف کی وجہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس وقت بلندی پر موجود تھا۔ اس نے سامنے کے رخ گھاس کا میدان اور اپنے نیچے درختوں کے پتے دیکھے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ پایا۔ کیوں کہ اسے چکر آ گیا تھا۔ اب وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ امی ہمیشہ کہتی ہے۔ اگر میں یہاں سے گر پڑوں تو میرا تو کچومر ہی نکل جائے۔ مگر امی اور ابو کو تو کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اب وہ اس وجہ پر غور کر رہا تھا۔ شام سے پہلے امی اور ابو کی واپسی ہوئی۔ وہ ٹرائے کے لیے چوگا لے کر آئے تھے۔ کھانے کے بعد ٹرائے نے امی سے پوچھا۔ ”امی جان آپ مجھے یہاں چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں؟“ ”دانے دنکے کی تلاش میں بیٹا...... پاک اللہ کی بنائی اس دنیا کا نظارہ کرنے اور ساتھ ہی آزادی کا لطف لینے۔“ ”آزادی کا لطف؟“ ”یہ لطف کیسا ہوتا ہے امی؟“ ٹرائے کی بات سن کر امی ہنس پڑیں۔ ”ابھی تم نہیں سمجھو گے مگر جلد ہی سمجھ پاؤ گے...... جب تم اڑنے لگو گے۔“ ”میں کیسے اڑ پاؤں گا امی...... مجھے تو بلندی سے خوف آتا ہے۔“ ”ابھی تم چھوٹے ہو اس لیے...... جلد ہی وہ وقت آئے گا۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ تمہارے پاس بھی ہمارے جیسے پر ہوں گے۔ پھر تم ان پروں کی مدد سے اڑو گے۔“ ”مگر مجھے اڑنا کون سکھائے گا؟“

ٹرائے مصیبت سے بولا۔ امی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ''میرے بچے...... آزادی اور اڑان تمہاری فطرت میں ہے تمہیں کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس وقت آنے کا انتظار کرو۔'' ٹرائے امی کی باتیں سمجھ نہیں پایا تھا۔ کیسے سمجھتا...... بچہ ہی تو تھا وہ...... پھر ان کی امن اور سلامتی والی زندگی میں مصیبت چپکے سے چلی آئی۔ ابھی دن کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت ٹرائے اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اچانک اس نے گھڑڑ...... گھڑڑ...... کی آوازسنی۔ ساتھ ہی اس نے یوں محسوس کیا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ ایک محفوظ کونے میں دبک گیا۔ چند لمحوں کے بعد فضا میں چڑچڑاہٹ کی آواز گونجی۔ ٹرائے کو یوں لگا کہ جیسے وہ کھائی میں گر رہا ہو۔ اس کے بعد اس نے چند ہچکولے کھائے اور پھر حرکت تھم گئی۔

''ارے...... یہ کیا؟'' اس نے ایک انسانی آوازسنی مگر وہ بات کا مطلب سمجھ نہیں پایا۔ ''کسی پرندے کا گھونسلا لگتا ہے...... ہیں...... اس کے اندر تو طوطے کا ایک بچہ بھی موجود ہے۔'' اب ایک انسانی ہاتھ گھونسلے کے اندر داخل ہوا۔ اس ہاتھ نے نرمی سے ٹرائے کو پکڑ لیا۔ خود کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر ٹرائے چیخنے لگا۔ جانے اس کی امی اور ابو کو اس بات کی کیسے خبر لگ گئی تھی کہ جس درخت پر ان کا آشیانہ تھا۔ وہ درخت اب گر چکا ہے۔ اب وہ دونوں اطراف کے درختوں پر بیٹھے شور مچا رہے تھے۔ ان کی ٹیں...... ٹیں کی آوازوں سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ مگر یہ ظالم لوگ ان کی فریاد سننے والے نہیں تھے۔ لکڑی کے ساتھ ساتھ وہ ٹرائے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے بنے۔ ٹرائے نہیں جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔ امی اور ابو سے جدائی تو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ اب وہ ایک بند مٹھی میں موجود تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ جس نے ٹرائے کو پکڑا تھا۔ اس کا نام بلال تھا۔ بلال، ٹرائے کو ایک کھلونے کے طور پر اپنے بیٹے فیضی کو دینا چاہتا تھا۔ فیضی ٹرائے کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''یہ آپ کو کہاں سے ملا ابو جی۔'' فیضی نے ٹرائے کو اپنی ہتھیلی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''وہاں جنگل میں...... ہم نے ایک درخت گرایا تو یہ ہمیں مل گیا اور سنو بیٹا...... یہ بچہ طوطوں کی ایک نایاب نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ تم اس کا خاص خیال رکھنا۔ تمہاری تھوڑی سی محنت سے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ یہ انسانی زبان میں باتیں کرنا بھی سیکھ جائے گا۔''

''آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں ابو جی۔'' بلال کی باتیں سن کر فیضی کو حیرت ہو رہی تھی۔ ''فیضی بیٹا...... میں نے اپنی زندگی میں جنگلوں میں گزار دی۔ اس وجہ سے جنگلی حیات کے بارے میں، میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا ہوں اور سنو بیٹا...... اسے بلی کے حملے سے بچا کر رکھنا۔'' بلال کو اچانک یہ بات یاد آ گئی تھی۔ ''جی ابو جی...... میں خیال رکھوں گا۔'' اب فیضی ٹرائے کی پرورش کرنے لگا۔ چند دنوں میں ٹرائے فیضی کے ساتھ مانوس ہو گیا۔ اب ٹرائے تھا اور فیضی تھا۔ دونوں زیادہ وقت ساتھ ساتھ گزارتے تھے۔ ٹرائے، فیضی کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور ٹیں...... ٹیں کی آواز کے ساتھ فیضی سے اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ جب فیضی اور گھر کے دوسرے افراد باتیں کرتے تو ٹرائے ان باتوں کو غور سے سنتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جملوں میں موجود الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتا۔ رات کو وہ فیضی کے کمرے میں ہی سوتا۔ وقت گزرتا رہا اور ٹرائے بڑا ہو گیا۔ اب ٹرائے انسانی زبان کے چھوٹے، چھوٹے جملے بول لیتا تھا۔ انسانوں میں رہتے ہوئے اس نے چلنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ مگر وہ بھول چکا تھا کہ اپنے پروں کی مدد سے وہ اڑ بھی سکتا ہے۔ کبھی کبھی ٹرائے سوچتا کہ میں ان انسانوں جیسا کیوں نہیں ہوں۔ حقی بات یہ تھی کہ ٹرائے بھول چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ اڑان بھولنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شناخت بھی بھول چکا تھا۔

ایک دن ٹرائے سیڑھیوں کے راستے چھت پر آیا اور پھر اپنی چونچ اور پنجوں کی مدد سے منڈیر پر چڑھ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی قصبہ تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سفید بادلوں کے گالے فضا میں تیر رہے تھے۔ قدرت کا یہ نظارہ دیکھتے ہوئے ٹرائے جھوم کر بولا۔ ''فیضی اوپر آ جاؤ...... دیکھو تو موسم کتنا پیارا ہے۔'' فیضی نیچے گھر کے کسی کام میں مصروف تھا۔ اس نے ٹرائے کی آواز سن لی تھی۔ اب فیضی بولا۔ ''ٹرائے...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم نیچے آ جاؤ۔ اوپر خطرہ ہو سکتا ہے۔'' ''خطرہ...... مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے۔'' ٹرائے سوچنے لگا۔ ٹرائے فیضی کی بات کا مفہوم سمجھ نہیں پایا تھا۔ ایسے میں ٹرائے نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک پرندہ فضا میں پرواز کرتا ہوا اسی کی طرف آ رہا تھا۔

پھر اس نے غوطہ لگایا اور ٹرائے کے پاس ہی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اب وہ لگا ٹائیں...... ٹائیں کرنے...... دیکھنے میں وہ پرندہ ٹرائے کا ہم شکل تھا اور زبان بھی وہ بول رہا تھا۔ جس زبان میں ٹرائے اپنی امی اور ابو جی کے ساتھ گفتگو کیا کرتا تھا۔ انسانوں کی زبان سیکھ لینے کے باوجود ٹرائے اپنی ماں بولی نہیں بھولا تھا۔ اپنے ابو اور امی سے جدائی کے بعد ٹرائے نے پہلی بار اپنے جیسا ایک طوطا دیکھا تھا اور ٹرائے اس سے خوف بھی کھا رہا تھا۔ اس جیسا ہونے کے باوجود وہ اس جیسا نہیں تھا۔ ''کون ہو تم؟'' ٹرائے نے اس سے ماں بولی میں پوچھا۔ ''میں ہوں جوائے...... میں اس جنگل میں رہتا ہوں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' جوائے کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ''میں یہاں رہتا ہوں...... یہ میرا گھر ہے۔'' ٹرائے بولا۔ ''نہیں...... یہ تمہارا گھر نہیں ہوسکتا...... یہ کسی انسان کا گھر ہے تمہارا گھر تو وہاں جنگل میں کسی درخت کی چوٹی پر ہونا چاہیے تم اس گھر میں کب سے رہ رہے ہو؟'' ''بچپن سے۔'' ٹرائے بولا۔ ''سمجھ گیا تم پالتو ہو۔ اور غلام بھی۔'' ''یہ پالتو اور غلام کیا ہوتا ہے۔'' ٹرائے ان دو الفاظ کا مفہوم بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی بات سن کر جوائے ہنس پڑا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں آزادی کا شعور بھی نہیں ہوگا۔'' ''آزادی مطلب۔'' ٹرائے کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ''اپنی مرضی سے...... اپنی پسند کے مطابق زندگی بسر کرنا۔''

''میں اس گھر میں اپنی مرضی سے...... اپنی پسند کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں۔'' ٹرائے اطمینان سے بولا۔ ''میں تو کہتا ہوں کہ تم اس گھر میں میرے دوست بن کر میرے ساتھ رہو۔ فیضی...... میرا مالک...... ہمارا اچھا خیال رکھے گا۔ وقت پر کھانا پینا...... دیکھ بھال۔'' ٹرائے کی بات سن کر جوائے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگیا۔

''واہ...... میں تمہیں آزادی کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم مجھے غلامی کا مفہوم سمجھانے لگ پڑے۔'' ''کیا مطلب۔'' ٹرائے حیرت سے بولا۔ ''اس بات کا مفہوم سمجھنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' جوائے اطمینان سے بولا۔ ''کہاں......؟'' ''وہاں جنگل میں...... جہاں سے تم آئے ہو۔'' جوائے کی بات سن کر ٹرائے کو کچھ یاد آنے لگا۔ وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔ جب بھونچال آیا اور درخت گر پڑا۔ تب اسے اس گھر میں لایا گیا تھا۔ ''مگر میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔'' ٹرائے دور جنگل میں موجود درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں میرے ساتھ اڑان بھرنا ہوگی۔'' جوائے بولا۔ ''مگر میں تو اڑ نہیں سکتا۔'' اس ایک لمحے میں ٹرائے افسردہ نظر آیا۔ ''خود پر یقین نہ ہونا...... یہی غلامی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ تم اڑ سکتے ہو...... اڑان تمہاری فطرت کا حصہ ہے، ہمت کرو...... اڑان بھرو...... اور آزادی کی طرف پرواز کرو۔'' جوائے اسے تحریک دے رہا تھا۔ اچانک ٹرائے کو اپنی امی کی ایک بات یاد آئی۔ ''آزادی اور اڑان...... تمہاری فطرت میں شامل ہے۔ میرے بچے۔'' ٹرائے سوچ میں گم تھا کہ جوائے زور سے چیخا۔ ''ہوشیار۔'' ٹرائے نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کی روح تک فنا ہو کر رہ گئی۔ یہ ایک جنگلی بلی تھی۔ وہ ٹرائے اور جوائے پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ خوف کے عالم میں ٹرائے نے منڈیر سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہوئے ٹرائے نے اپنے پر کھولے۔ توازن درست کیا۔ اب وہ جو پھڑ پھڑایا تو ہوا کی لہروں نے اسے سہارا دے دیا۔ ''آزادی کی طرف اڑان تمہیں مبارک ہو۔'' جوائے مسکرا کر بولا۔ اب ٹرائے، جوائے کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ ایسے میں ٹرائے نے ایک آواز سنی۔ ''کہاں جا رہے ہو ٹرائے۔'' یہ فیضی تھا۔ جو نیچے سے اپنے پالتو طوطے کو آواز دے رہا تھا۔ ''میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں فیضی۔'' ٹرائے پرواز کرتے ہوئے چیخ کر بولا۔ فیضی ٹرائے کو پرواز کرتا دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ پھر وہ دکھ بھری آواز میں بولا۔ ''بھلا کبھی جانے والے بھی لوٹ کر واپس آتے ہیں۔'' فیضی کی بات درست تھی۔ ٹرائے پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ جنگل کی آزاد فضاؤں میں...... اپنے جیسے بہت سے دوستوں سے ملنے کے بعد...... اس نے آزادی کے مفہوم کو پا لیا تھا۔ ☆☆☆

دعا

آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ
اپنے وطن میں راج کریں صبح و شام لوگ
گدڑی کہ جس نے پالا ہمیں لعل کی طرح
آکاش اس کے سر پہ رہے شال کی طرح
ماں کی طرح سے کرتے ہیں احترام لوگ
آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ

گھر میں کچھ بھی کھانے کو نہ تھا۔ رات کی بچی ہوئی ایک روٹی تھی، سورن نے وہ آلو ماسٹر کو کھلا دی تھی۔ آلو ماسٹر کا پیٹ بھرا ہو گا تو تماشا دکھا کر وہ کچھ نہ کچھ کما ہی لے گا اور سب گھر والوں کو کھانا مل جائے گا۔ سورن، آلو ماسٹر کو لے کر نکل گیا۔ لیکن یہ کیا! دوپہر ہونے کو آئی، آج کسی نے بندر والے کو آواز بھی نہ دی۔

سورن کا آلو ماسٹر دوبارہ بھوکا ہو چلا تھا۔ سورن کے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ رہے تھے۔ ادھر گھر میں چھوٹے بچے اور ان کی ماں بھوکی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب 1947ء میں پاکستان بننے کا اعلان ہوا تھا۔ سب ہی لوگ پریشان تھے۔ بندر کا تماشا دیکھنے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔

''بندر والے'' کسی نے آواز دی۔ جس نے سورن کو چونکا دیا۔ اس نے سوچا، بھگوان بھلا کرے، کسی نے آواز دے دی؟

یہ آواز شاکر نے دی تھی۔ ابو نے کہا تھا صبح صبح گھر سے نکلنا ہے۔ امی نے کچھ ایسی چیزیں پکا لی تھیں جو وہ ٹرین میں ساتھ رکھ سکتی تھیں۔ گھر میں کسی کو فرصت نہ تھی کہ شاکر سے بات کرتا۔ بندر والے کی ڈگڈگی سن کر شاکر بھی خوش ہو گیا اور اسے آواز دے دی۔ ڈگ ڈگ کرتا ہوا سورن اپنے آلو ماسٹر کو لے کر شاکر کی کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ شاکر نے کہا۔ ''تماشا دکھاؤ۔''

''بابو پہلے کچھ کھانے کو دے دو، میرا آلو ماسٹر صبح سے بھوکا ہے۔'' بندر والے نے کہا۔

شاکر دوڑا ہوا امی کے پاس گیا کہنے لگا۔ ''امی بندر والے کا بندر صبح سے بھوکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بندر والے کو بھی کھانا چاہیے۔ آپ کھانا دے دیں۔''

امی سوچ میں پڑ گئیں۔ نہ جانے سفر میں کتنے لوگ ہوں گے؟ اگر یہاں کھانا خرچ ہو گیا تو سفر میں کیا ساتھ لے جائیں گے؟ پھر سوچا کہ کوئی بات نہیں، گھر کے سامنے ایک آدمی بھوکا ہے، اس کا بندر بھی بھوکا ہے کیوں نہ یہ کھانا اس کو دے دوں؟ قسمت میں کھانا ہو گا تو ہمیں اللہ اور دے گا۔ امی نے ڈھیر سارا کھانا اٹھا کر بندر والے کو دے دیا اور کہا۔

''پیٹ بھر کر کھاؤ، اپنے بندر کو کھلاؤ اور جو بچ جائے اپنے گھر لے جانا۔ ہمارے لیے دعا کرنا کہ ہم سب خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔''

امی نے رات بھر جاگ کر سفر کے لیے دوبارہ کھانا تیار کر لیا۔ یہ لوگ پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ دو دن سفر کرنے کے بعد رات کو پاکستان پہنچے۔ سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پاکستان کی مٹی کو چوما اور اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

کہیں سے ایک آواز آئی۔ ''آلو ماسٹر تو بھی سجدہ کر اللہ کے حضور۔'' شاکر نے دیکھا کہ سورن اپنے گھر والوں کے ساتھ، آلو ماسٹر کا ہاتھ پکڑے، پاکستان کی مٹی کو چوم کر اللہ اکبر کہہ رہا ہے۔

''ارے بندر والے تم یہاں کیسے؟'' شاکر نے پوچھا۔ بندر والے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بابو، ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں۔ آپ نے تو بس ایک بھوکے انسان کا، اس کے گھر والوں کا اور اس کے بندر کا پیٹ بھرا۔ اتنے لوگوں کو بھوک سے مرنے سے بچا لیا۔ آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ دیتا؟ اگر مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو میں بھی مسلمان ہوں۔''

سورن پاکستان آ گیا اور مسلمان ہو گیا۔ وہ کراچی میں رہتا تھا اور روز کلفٹن جا کر تماشا کرتا۔ آلو ماسٹر بیس سال تک زندہ رہا لیکن روز تماشا ختم کر کے آلو ماسٹر پھدک پھدک کر سارے بڑوں اور بچوں کو سلام کرتا اور ڈبہ اٹھا کر پیسے مانگتا۔ پھر سورن کہتا۔

''آلو ماسٹر اب اپنے شاکر بابو کے لیے دعا کر کہ شاکر بابو اور ان کے گھر والے ہمیشہ خوش رہیں۔''

آلو ماسٹر ڈبے کو زمین پر رکھتا اور اس کے اوپر بیٹھ جاتا، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا جیسے دعا مانگ رہا ہو۔

جب لوگ سورن سے پوچھتے کہ یہ شاکر بابو کون ہیں؟ سورن بس اتنا ہی کہتا۔ ''ہیں ایک، اللہ کے نیک بندے۔''

(بندر والے نے اپنی یہ کہانی مجھے خود سنائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ابھی تک شاکر بابو کے گھر میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہے۔ 1976ء تک آلو ماسٹر زندہ رہا۔ اس کے مرنے کے چند دن بعد سورن بھی اللہ کو پیارا ہو گیا)

☆☆☆

''سنڈے ہو یا منڈے روز کھاؤ انڈے''

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد عبداللہ نے آج بھی انڈہ کھانے سے انکار کر دیا۔ امی ابو حیران تھے کہ عبداللہ کا تو نعرہ ہوتا تھا کہ ''سنڈے ہو یا منڈے روز کھاؤ انڈے'' پھر اسے کیا ہو گیا کہ وہ انڈے کھانے سے انکاری ہے۔ سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور سے عبیرہ جو کہ اس کی خالہ زاد تھی اپنے امی ابو کے ساتھ کراچی پہنچ گئے تھے۔ پچھلی سردیوں میں عبداللہ، فاطمہ اور زینب تینوں بہن بھائی اپنے امی ابو کے ساتھ لاہور گئے تھے، جب کہ اس سال وعدے کے مطابق عبیرہ لوگ کراچی آئے تھے۔ ابھی عبیرہ، بڑی باجی فاطمہ اور چھوٹے بھائی مہد اور اس کے امی ابو کو آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اس دن بھی ناشتے کی ٹیبل پر انڈوں والی پلیٹ کو نہ صرف عبداللہ نے ایک طرف کر دیا بلکہ، فاطمہ، زینب اور عبیرہ نے بھی انڈوں والی پلیٹ کو ایک طرف کھسکا دیا۔ اب کی بار پلیٹ ماموں اطہر کی طرف جو گئی تو انہوں نے بھی بچوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پلیٹ کو دوسری پلیٹ سے ڈھانپ دیا۔

''ارے بھئی اطہر میاں آپ بھی بچوں کے ساتھ ہی بچے بن گئے۔ ناشتہ اور وہ بھی سردیوں کا ناشتہ انڈوں کے بغیر کیسے کر لیتے ہو۔'' عبداللہ کے ابو نے اطہر ماموں کو مخاطب کیا۔

''بھائی جان! بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے لیکن......!''

''لیکن کیا......؟''

''ماموں مرغی کے انڈے اچھے ہوتے ہیں، یہ جسم میں غذائی ضروریات کو پوری کرتی ہے۔ اس کی زردی کے بہت سے فوائد بھی تو ہیں نا۔'' عبیرہ نے مسکراتے ہوئے ذومعنی انداز میں انڈے کی افادیت پر بات شروع کی۔

''ہاں یہ دیکھو! عبیرہ کو بھی انڈے کی افادیت کا معلوم ہے۔'' عبداللہ کے ابو ظفر صاحب نے انڈے کی پلیٹ ایک بار پھر ماموں اطہر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی جان...... یہ بچی مرغی کے انڈوں کی بات کر رہی ہے۔''

''ہاں تو یہ بھی مرغی کے ہی انڈے ہیں کون سے کچھوے کے انڈے ہیں۔'' عبداللہ کی امی نے لقمہ دیا۔

''کچھوے کے انڈے...... اسی لیے تو میں نے انڈے کھانے سے توبہ کر لی ہے۔ کتنے گندے ہوتے ہیں یہ انڈے۔'' عبداللہ نے انڈوں کو پرے کرتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

''یہ کیا ماجرا ہے بھئی...... ہمیں کیوں شش و پنج میں ڈال رہے ہو آپ سب۔'' عبیرہ کے ابو جو اتنی دیر سے باتیں سن رہے تھے انہوں نے پراٹھے کا ایک لقمہ منہ میں چباتے ہوئے کہا۔

''بس...... بس بھائی جان رہنے ہی دیں یقیناً یہ عبیرہ کے کام ہی ہوں گے جو ہمیشہ کی طرح کسی نئی مہم کی تلاش میں عبداللہ سمیت ہم سب کو بے وقوف بنا رہی ہو گی۔'' عبیرہ کی امی نے ہنستے ہوئے سب کی طرف دیکھا اور سب ہی مسکراتے ہوئے ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ کیوں کہ پھر انہیں منوڑا کی سیر کے لیے بھی نکلنا تھا۔ پکنک کا پروگرام بھی منوڑا پر ہی تھا۔

☆☆☆

اگلے دن عبداللہ، فاطمہ، اطہر ماموں اور عبیرہ کی ٹیم بازار میں موجود دکان پر موجود تھے۔ جہاں سے وہ روزانہ انڈے خریدتے تھے۔

''ماموں! اس دکان والے کو بھی شاید معلوم نہ ہو۔ اس لیے میرے خیال میں ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا۔'' عبیرہ نے گاڑی میں سے نکلے بغیر اطہر ماموں کو روک دیا۔

''ایک منٹ رکیں...... ابھی دس بج رہے ہیں۔ میں نے چند دن پہلے دیکھا تھا جب ایک وین آئی تھی اور اس وین سے ہی انڈے اتارے جا رہے تھے۔ اس دن تو تقریباً بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ ہم یا تو انتظار کر لیتے ہیں یا پھر گھر چلتے ہیں اور بارہ بجے سے پہلے دوبارہ آجائیں گے۔'' عبداللہ نے مشورہ دیا۔ عبداللہ کا مشورہ ٹھیک تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ واپس گھر روانہ ہو گئے۔

اپنے اگلے منصوبے کے مطابق وہ لوگ بارہ بجے سے پندرہ منٹ پہلے ہی ایک بار پھر انڈوں والی دکان کے سامنے موجود تھے۔ احتیاطاً وہ لوگ اطہر ماموں کی گاڑی میں ہی موجود رہے۔ بارہ بج چکے تھے لیکن وین نہ آئی۔ انہوں نے مزید انتظار کیا لیکن وین نہیں آئی تھی۔

''لگتا ہے ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔'' ماموں نے مایوس ہو کر کہا۔

''عبداللہ وہ دیکھو...... کیا یہ ہی تو سفید رنگ کی گاڑی نہیں جو انڈوں کی سپلائی دیتی ہے۔'' عبیرہ نے بازار میں داخل ہوتی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں لگتی تو یہ گاڑی ہے۔ چلیں دیکھتے ہیں ذرا نزدیک آنے دو۔'' بازار میں داخل ہونے والی سفید رنگ کی پک اپ اسی دکان کے سامنے آکر رکی۔ گاڑی سے ایک کالے بھورے رنگ کا چھوٹے چھوٹے بالوں والا ایک مرد باہر آیا۔ دکان دار کے پاس جا کر کچھ بات کی اور پھر ایک درجن کے قریب انڈوں کے ٹرے نکال کر دکان کے کاؤنٹر پر رکھ دیے۔

وہ سب گاڑی میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔

''اب بغیر ثبوت کے تو ہم اسے پکڑ نہیں سکتے۔ اب کیا کیا جائے۔'' فاطمہ نے ہولے سے کہا۔

''کرنا کیا ہے ہم اس کی ریکی کرتے ہیں اور اس گاڑی کے ساتھ ساتھ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے ٹھکانے کا پتا چلاتے ہیں کہ یہ لوگ اپنا انڈوں کا ذخیرہ کہاں رکھتے ہیں۔'' عبیرہ نے کہا۔

''لیکن عبیرہ! اگر واقعی یہ لوگ ایسی منفی سرگرمیوں میں ملوث ہوئے تو یقیناً یہ عام لوگ نہیں بلکہ خطرناک لوگ ہو سکتے ہیں اور ہم نہتے اگر پھنس گئے یا کسی شبے میں انہوں نے ہماری گاڑی کو پکڑ لیا تو کراچی میں ایسے ایسے گروہ موجود ہیں جو انسان کا تیا پانچا کر کے پتا بھی نہیں چلنے دیتے۔'' عبداللہ کی آواز میں خوف تھا۔

''اطہر ماموں گاڑی اس گاڑی کے پیچھے لگائیں، ہم بس جگہ دیکھ کر واپس آجائیں گے۔ پھر واپس آکر ایک بار پھر اسی دکان سے انہیں انڈوں کی خریداری کریں گے جو انڈے یہ دکان دار کو دے کر گیا ہے۔'' عبیرہ جو کہ اس سارے منصوبے کو تیار کرنے والی تھی جیسے اس نے اطہر ماموں کو حکم صادر کیا ہو۔ اطہر ماموں نے مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی اسی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ شاید انڈوں والی گاڑی کی یہ آخری سپلائی تھی جو اس نے کسی اور جگہ گاڑی نہیں روکی بلکہ وہ کیماڑی ڈاک خانے سے نکل کر کے پی گراؤنڈ اور شیریں جناح کے راستے ایک کھلی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ اس کی رفتار تیز ضرور تھی لیکن خطرناک حد تک تیز نہ تھی۔ اس لیے اطہر ماموں کو ان کا پیچھا کرنے میں مشکل پیش نہ آئی۔

''یہ کون سا علاقہ شروع ہو گیا ہے؟ جہاں مچھلی کی بدبو کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی ہے۔'' عبیرہ نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ حیدری کا علاقہ ہے۔ اس کے بھی جنوب میں سمندر ہے۔ یہاں مچھیروں کی بڑی بڑی بستیاں ہیں۔ یہ لوگ اپنی لانچوں کے ذریعے کھلے سمندر میں جاتے ہیں اور کئی کئی ہفتے سمندر میں رہ کر مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ اس علاقے میں میرے ایک دوست رہتے ہیں۔ انسپکٹر حسین جرار صاحب اگر کسی نے روکا بھی تو ہم اسی کا ذکر کر دیں گے۔'' اطہر ماموں نے بتایا۔ گاڑی حیدری کے بازار سے گزرتی ہوئی ایک موڑ مڑی، اتنی دیر ان کی گاڑی بھی موڑ مڑ چکی

تھی۔ سامنے کا منظر عبیرہ کے لیے خواب سا تھا کیوں کہ سامنے آبادیوں کے درمیان سمندر کا پانی واضح نظر آرہا تھا اور اس سمندر کے پانی پر ایک نہیں سینکڑوں لانچیں کھڑی تھیں۔ جوں جوں وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے، لانچیں بڑی ہوتی جارہی تھیں اور سمندر بھی وسیع ہوتا نظر آرہا تھا۔ انڈوں والی گاڑی سڑک سے اتر کر ایک چوڑی گلی میں داخل ہوئی، ابھی یہ لوگ چوڑی گلی میں داخل ہونا ہی چاہ رہے تھے انہوں نے انڈوں والی گاڑی کو گلی میں واقع دوسرے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ گلی کی نکڑ سے ہی اس کا بڑا سا لکڑی کا پھاٹک واضح دکھائی دیتا تھا۔ اطہر ماموں نے گاڑی وہیں روک کر واپس موڑی اور ایک بار پھر سڑک پر ڈال لی۔

''اب کیا ارادے ہیں؟'' فاطمہ نے عبیرہ سے پوچھا۔ ''ارادے کیا ہونے ہیں، بس عبیرہ کا شک تھا اور اس شک کی بنا پر ہم صرف انڈوں والی گاڑی کا گھر ہی دیکھ سکیں گے۔ عبیرہ کا کراچی میں آکر سراغ رسانی کا شوق بھی پورا ہوگیا۔ اب واپس گھر چلیں اور مزے سے انڈے کھائیں کیوں کہ انڈے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ پہلے ہی عبیرہ کے شک نے میرے انڈے کھانے کے شوق کو مار ڈالا تھا۔'' عبداللہ نے قہقہہ لگایا۔

''عبداللہ میاں! ہم پہلے انسپکٹر حسین کے پاس جائیں گے ان سے چائے پییں گے، چلیں آج آپ کی ملاقات انسپکٹر صاحب سے بھی کرادیتے ہیں۔'' اطہر ماموں نے اپنے موبائل سے انسپکٹر حسین کا نمبر ڈائل کیا اور پھر دوسری طرف بات کرنے لگے۔ فون بند ہوتے ہی بولے۔

''انسپکٹر حسین ابھی اپنے تھانے میں ہی ہیں، وہ ہمارا چائے پر انتظار کررہے ہیں۔ اب تو ان سے چائے پیے بغیر ہم نہیں جاسکتے کیوں کہ ان کی دعوت بھلا کیسے جھٹلائی جاسکتی ہے۔'' ساتھ ہی اطہر ماموں نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ ایک سرخ رنگ کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے انسپکٹر حسین نے انہیں دیکھ لیا تھا اس لیے وہ اپنے دفتر سے باہر نکلے اور گرم جوشی سے بچوں اور اطہر ماموں کا استقبال کیا۔

''ارے بھئی! یہ بچوں کو لے کہاں گھوم رہے ہو۔ تمہارا فون میرے لیے سرپرائز تھا لیکن جیسے ہی تم نے بتایا کہ بچے بھی تمہارے ساتھ ہیں تو تمہیں تو پتا ہے کہ بڑے تو مہمان اپنی جگہ اگر بچے میرے مہمان ہوں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا ہوسکتا ہے۔''

''انکل آپ تو وجیہہ نوجوان ہیں۔ ورنہ تو ڈراموں میں تو بڑے کرخت قسم کے انسپکٹر دیکھنے کو ملتے ہیں۔'' عبیرہ نے ہولے سے کہا۔ انسپکٹر حسین نے سنتے ہی قہقہہ لگایا اور باقی بچوں سمیت انہیں پیار کیا۔

چائے لگ چکی تھی۔ بچوں کے لیے جوس منگوائے گئے تھے۔ اس دوران اطہر ماموں اور بچے اس علاقے میں آنے کا مقصد بتا چکے تھے۔

''ہونہہ! تو یہ بات ہے۔ بات تو کسی حد تک بڑی خطرناک ہے۔ لیکن عبیرہ بیٹا آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ آپ کی بات میں وزن ہے۔ چلیں میرے لیے مشکل ضرور ہے کہ میں ایسے لوگوں کے اڈے پر چھاپہ ماروں لیکن ہمارے ایس پی صاحب بہت اچھے ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں اور ان سے مشورہ کرکے کسی بہانے سے سرچ آپریشن کی صورت میں اس اڈے کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے کل تک کا وقت دیں۔

☆☆☆

اگلے دن صبح صبح ہی انسپکٹر حسین نے اطہر ماموں کو فون کردیا کہ وہ لوگ دوپہر تک تھانے پہنچ جائیں۔ ایس پی صاحب نے اجازت دے دی ہے۔ چونکہ میں اس علاقے کے تھانے کا انچارج ہوں۔ شک کی بنیاد پر انہوں نے کہا ہے کہ میں اپنی نگرانی میں سرچ آپریشن کی صورت میں اپنی نفری کے ساتھ اس اڈے کو چیک کروں۔ اطہر ماموں نے بچوں کو انسپکٹر حسین کے فون کا بتایا۔ وہ لوگ اپنے وقت پر تھانے میں پہنچ گئے۔ انسپکٹر حسین اور نفری تیار تھی۔ اطہر ماموں اور بچوں کی نشان دہی پر شک کی بنیاد پر جب اس اڈے پر چھاپہ مارا گیا تو وہاں سینکڑوں کی تعداد میں انڈوں کے ٹرے برآمد ہوئے۔ جہاں انڈے رکھے گئے اس کے ساتھ والے بڑے سے ہال نما کمرے میں کچھ انڈے ٹوٹے ہوئے تھے۔ جب کہ ثبوت کے طور کچھ ٹوٹے ہوئے انڈوں میں مٹیالے رنگ کے کچھوؤں کے بچے بھی مرے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ وہ انڈے تھے جن میں کچھوؤں کے بچے بالکل تیار تھے لیکن یہ انڈے بھی دوسرے انڈوں کے ساتھ یہاں آگئے تھے۔ شک کی بنیاد پر مارا گیا چھاپا، ایک ایسے گروہ کی نشان دہی کرگیا تھا جو کئی سالوں سے اس مکروہ

دھندے میں ملوث تھے۔ اس کی خبر جلد ہی دور تک پھیل گئی۔ پورے ملک کا میڈیا اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ مکروہ دھندے میں ملوث گروہ کے بہت سے لوگ گرفتار ہو چکے تھے۔ جب ایک ٹی وی رپورٹر نے انسپکٹر حسین سے سوال کیا کہ آپ کو کیسے شک ہوا کہ یہاں کچھ گڑ بڑ ہے تو انسپکٹر حسین نے اطہر ماموں اور بچوں کی جانب اشارہ کر دیا کہ اصل میں ان بچوں کی وجہ سے ہم اس گروہ تک پہنچ پائے ہیں۔ ان بچوں میں خصوصاً یہ بچی جس کا نام عبیرہ ہے۔ رپورٹر عبیرہ کی جانب بڑھا، کیمرہ آن تھا جب عبیرہ بتا رہی تھی کہ اسے شک اس دن ہوا جب ایک ابلا ہوا انڈا اس نے توڑا تو اس کی زردی زرد رنگ کی بجائے نیالی نیالی سی تھی۔ دوسرا شک اسے اس بات سے ہوا کہ مرغی کے انڈے بیضوی شکل کے ہوتے ہیں جب کہ یہ انڈے بیضوی کی بجائے گول گول زیادہ ہیں۔ اس نے اپنی نانی اماں سے سن رکھا تھا کہ مرغی کے انڈوں اور دوسرے جانوروں کے انڈوں میں کیا فرق ہوسکتا ہے۔ اس طرح مرغی کا انڈہ سفید یا دودھیا سا ہوتا ہے جب کہ اس نے فریج میں جا کر انڈوں کو دیکھا تو ان کا رنگ نہ سفید تھا اور نہ دودھیا۔ اسی شک کو اس نے اطہر ماموں اور عبداللہ پر واضح کیا اور پھر ساری کہانی سنا دی۔ انسپکٹر حسین نے بتایا کہ وہ بہت جلد ایس پی صاحب سے سفارش کر کے عبیرہ اور باقی لوگوں کو حسن کارکردگی کا میڈل دلوائیں گے۔

(اگلے شمارے میں پڑھنا نہ بھولیے گا ''مشن اسکواڈ'' کا تیسرا کارنامہ) ☆☆

آنکھوں سے خون کے فوارے چھوڑنے والی چھپکلی

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ دنیا میں ایک ایسی چھپکلی پائی جاتی ہے جو بوقت ضرورت اپنی آنکھوں سے خون کے فوارے اڑا سکتی ہے۔ یہ عمل وہ شوقیہ نہیں کرتی بلکہ یہ شعبدہ اپنی جان بچانے کے لیے اس کا آخری ہتھیار ہے۔

اس چھپکلی کو Horned lizard کا نام دیا گیا ہے۔ عرف عام میں اسے ''سینگوں والا مینڈک'' (Horny or Horned toad) بھی کہتے ہیں۔ اس نام کی وجہ اس کی مینڈک جیسی شکل ہے۔ اس کا جسم چوڑا، چھوٹا اور بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کو ''سینگوں والا'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے سر اور جسم کے دونوں جانب سینگوں جیسے کانٹے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ مینڈک جیسی نظر آنے کے باوجود چھپکلی کی ہی ایک نادر قسم ہے۔ یہ امریکہ اور میکسیکو کے مغربی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ گرم، خشک اور صحرائی میدانوں میں رہنا پسند کرتی ہے لیکن کبھی مجبوراً پہاڑی علاقوں میں بھی بسیرا کر لیتی ہے۔ Horned lizard کی خون کے فوارے چھوڑنے والی خصوصیت چھپکلیوں کی صرف اسی قسم میں پائی جاتی ہے لیکن یہ اپنی اس صلاحیت کا استعمال بحالت مجبوری اور جان بچانے کے آخری حربے کے طور پر کرتی ہے۔ جب یہ چھپکلی خود کو خطرے میں محسوس کرتی ہے تو سب سے پہلے اپنے آپ کو چپٹا کر کے زمین سے چپکا لیتی ہے۔ اس کا رنگ بھورا یا مٹیالا اور جسم دھبے دار ہوتا ہے اس لیے حملہ آور جانور کے لیے اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس کو پہچان لیا جائے تو یہ شکاری جانور کو بھگانے کے لیے اپنے جسم کو پھلا کر زور سے پھنکارتی ہے اور اپنے کانٹوں کو پھیلا لیتی ہے۔ بعض اوقات اس کے تمام حربے ناکام ہو جاتے ہیں اور بھوکا جانور کسی طرح اپنے شکار سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایسے میں آخری کوشش کے طور پر Horned Lizard اپنی آنکھوں سے خون کے فوارے چھوڑ کر مقابل حملہ آور کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اکثر اوقات اس صورت میں شکاری جانور دُم دبا کر بھاگنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔

خون کے فوارے چھوڑنے کے لیے Horned lizard اپنے سر کے بلڈ پریشر میں بے پناہ اضافہ کر لیتی ہے۔ اس سے اس کی آنکھوں میں موجود خون کی باریک شریانیں پھٹ جاتی ہیں اور آنسو بہانے والی نالیوں سے خون زبردست دباؤ کے ساتھ اچھل کر باہر نکلتا ہے۔ ☆☆☆

ننھے قارئین

بوجھو تو جانیں

1- اس نے سب کے کام سنوارے
ورنہ ہوتے احمق سارے
(ماہتاب عدیل)

2- ایک میدان میں پانچ سڑکیں

3- روشن روشن اس کی دم
رات کو حاضر دن میں گم
(محمد مہرین، واہ کینٹ)

4- آگ کے نیچے پانی
اس کی یہی نشانی

5- میں آ جاؤں، تم کھو جاؤ
میں جاؤں تو تم آ جاؤ

6- مجھ کو تیری بات بتائے
میری تجھ کو بات سنائے
چغلی بھی یہ کھاتا جائے
سب کے سنگ یہ گاتا جائے
(نادیہ رفیق، وھیانوالہ)

7- چپ بیٹھے تو بور کرے
ہاتھ مارو تو شور کرے

8- ایک جانور بڑا نرالا
منہ ہے اس کا ہندسوں والا
سارا دن ہے ٹک ٹک کرتا
پھر بھی نہیں منہ اس کا تھکتا
(عیشۃ الراضیہ، لاہور)

جوابات: 1-عقل 2-ہاتھ 3-جگنو 4-حقہ 5-نیند 6-ٹیلی فون 7-ڈھولک 8-گھڑی

ہمارا گاؤں چوہلٹہ خرد ہندوستان کی سب سے بڑی سکھ ریاست پٹیالہ کی سرحد پر تھا۔ اس سے آگے انگریزی عمل داری کا ضلع انبالہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس لیے ہمارے لین دین، آمدورفت، تعلیم، رشتے داریاں وغیرہ سبھی انبالہ ضلع کے لوگوں کے ساتھ تھیں۔ ضلع انبالہ کی تحصیل کھرڑ کا صدر مقام ہمارے گاؤں سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہیں وہ کرسچین ہائی اسکول تھا جس میں ہمارے گاؤں کے چودہ لڑکے پڑھتے تھے۔ یہ چودہ کے چودہ لڑکے روزانہ پانچ میل پیدل جاتے اور پانچ میل پیدل آتے تھے۔ ان چودہ طالب علموں میں سے مسلمان طلبہ کی تعداد مجھ سمیت صرف دو تھی۔

ان دنوں پرائمری میں پانچ جماعتوں کے بجائے چار جماعتیں ہوتی تھیں۔ چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد طالب علم کسی مڈل یا ہائی اسکول میں داخلہ لیتے تھے۔ میں بھی پرائمری اسکول نیا شہر سے چار جماعتیں پاس کرنے اور وظیفے کے امتحان میں شان دار کام یابی حاصل کرنے کے بعد پانچویں جماعت میں اسی کرسچین ہائی اسکول کھرڑ میں داخل ہوا جہاں کبھی میرے والد محترم نے تعلیم حاصل کی تھی اور جہاں میرے بڑے بھائی ساتویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔

پانچویں جماعت ہی میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ میری لکھی ہوئی ایک کہانی ہمارے اردو کے استاد پنڈت ہنس راج شرما کو بے حد پسند آئی اور اسے انہوں نے اسکول کے پندرہ روزہ رسالے ”بچوں کا کھیل کھلونا“ میں شائع کیا۔

”بچوں کا کھیل کھلونا“ پرائمری کے لڑکوں کے لیے تھا۔ مڈل اور ہائی جماعتوں کے طلبہ کے لیے اسکول کی طرف سے ماہانہ رسالہ ”اسکول جرنل“ شائع ہوتا تھا۔ لکھنے لکھانے کی چاٹ تو پنڈت ہنس راج نے لگا ہی دی تھی، چناں چہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میرا شمار اسکول جرنل کے مستقل مضمون نگاروں میں ہونے لگا تھا۔

ادارہ اسکول جرنل کی طرف سے ”اسکول جرنل“ کا ایک خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے لیے نام ور مضمون نگار حضرات سے فوٹو اور حالات زندگی طلب کیے گئے تھے۔ نام ور مضمون نگاروں کی اس فہرست میں میرا نام بھی شامل تھا۔ یہ خاص نمبر موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد ستمبر 1947ء کو اسکول موسم گرما کی چھٹیوں کے لیے بند ہوا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ یہ دن میرا اس اسکول میں آخری دن ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس اسکول کے در و دیوار کو دوبارہ دیکھنا مجھے پھر کبھی نصیب نہ ہوگا اور ان ہستیوں کی صرف یادیں ہی دل میں

رہ جائیں گی جنھوں نے محمد یونس کو ادیب محمد یونس حسرت بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

پاکستان کے قیام سے کئی مہینے پہلے ہی ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ پہلے مشرقی بنگال کے ضلع نواکھالی میں فسادات ہوئے، پھر راول پنڈی میں یہ آگ بھڑکائی گئی اور پھر حصار رہتک کا علاقہ ان فسادات کی لپیٹ میں آیا۔ راول پنڈی کے علاقے سے جو ہندو نکلنے پر مجبور ہوئے تھے، ان میں سے بہت سوں نے ہمارے آس پاس کے شہروں میں پناہ لی تھی۔ ان کی وجہ سے ہر جگہ ہندوؤں اور سکھوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیل رہی تھی۔

14 اگست 1947ء کا دن پاکستان کے قیام کا اعلان لے کر آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے باپ دادا کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہونے لگی تھی۔ شہروں کے شہر اور دیہات کے دیہات ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کی وجہ سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ سوتل، محمود پور، بڑا گاؤں اور دیگر قریبی دیہات کے مسلمان اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر چوہلٹہ خرد میں آ گئے تھے۔ وہ گاؤں جس کی مسلمان آبادی پہلے ایک ہزار تھی، اب اس میں پانچ ہزار مسلمان تھے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ خطرے کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ کھرڑ کا قصبہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ کھرڑ سے چھ میل دور کورالی کے شہر میں ایک مہاجر کیمپ قائم ہو چکا تھا اور کورالی سے نو میل پرے روپڑ کے قصبے کے مسلمان بھی ہجرت کر کے کورالی کے کیمپ میں آ چکے تھے۔ اس کیمپ کی حفاظت بلوچ رجمنٹ کے جوان کر رہے تھے۔ میرے والد محترم چودھری شاہ نواز خاں جو اس وقت روپڑ کے ڈاک خانے میں کلرک تھے، وہ بھی روپڑ کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ہجرت کر کے کورالی کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔

گاؤں کے بزرگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ اس صلاح مشورے کے مطابق تین آدمی گھوڑیوں پر سوار ہو کر کورالی مہاجر کیمپ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے فوجی دستہ لائیں اور سارے گاؤں والے فوجی جوانوں کی حفاظت میں گاؤں سے مہاجر کیمپ پہنچیں۔ جس روز یہ تینوں آدمی کورالی کیمپ پہنچے، اس روز کورالی سے ایک اسپیشل ٹرین ان مہاجروں کو لے کر پاکستان روانہ ہو رہی تھی جو روپڑ سے کورالی کیمپ میں آئے تھے۔ والد محترم کو ہمارے متعلق کوئی پتا نہیں تھا ہم کس حال میں ہیں اور وہ روپڑ کے دوسرے مہاجروں کے ہمراہ اسپیشل ٹرین میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اپنے گاؤں کے تین آدمیوں کو دیکھ کر رک گئے اور انہوں نے اس اسپیشل ٹرین میں سوار ہونے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اب وہ کیمپ میں ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔

ہمارے گاؤں سے جو تین آدمی فوجی دستہ لینے کورالی گئے تھے، ان میں ایک نواب علی خان تھے جو نعمت علی خان نمبردار کے بڑے بیٹے اور میرے تایا تھے۔

دوسرے دو آدمی جو ان کے ساتھ گئے تھے، ان میں ایک عبدالعزیز اور دوسرا مسیتے خاں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نہ جانے کیسے یہ افواہ پھیل گئی کہ نواب علی خان، عبدالعزیز، مسیتے خاں اور

ان کے ساتھ شاہ نواز خاں (میرے والد محترم) کورالی سے چوبلثہ خرد آ رہے تھے کہ کھرڑ کے قریب خان پور والی ندی پر ہندوستانی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

اس خبر سے ہم لوگوں کی جو حالت ہوئی سو ہوئی گاؤں والوں کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ اللہ کی ذات پر توکل کر کے گاؤں سے نکل کھڑے ہوں اور کسی مہاجر کیمپ میں پہنچ جائیں۔ ایک کیمپ تو مشرق کی سمت میں کورالی میں تھا جس کا فاصلہ گاؤں سے گیارہ بارہ میل بنتا تھا۔ ایک اور مہاجر کیمپ مغرب کی سمت ایک قصبے مانکپور رکھیڑہ میں تھا جس کا فاصلہ سات آٹھ میل تھا۔ سب نے مانکپور رکھیڑہ کی طرف چلنے کا ارادہ کیا مگر ابھی گاؤں سے نکلنے نہ پائے تھے کہ خبر ملی کہ راستے میں فلاں جگہ سکھوں نے ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ چناں چہ مانکپور رکھیڑہ جانے کا ارادہ ملتوی ہو گیا۔

اگلے روز یعنی 12 ستمبر 1947ء کو سارے لوگ اللہ کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے کھرڑ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ طے یہ پایا تھا کہ کھرڑ کے قریب پکی سڑک پر پہنچ کر کورالی کی طرف چل دیں گے۔ کچھ ضروری سامان بیل گاڑیوں میں لاد لیا گیا تھا۔ جو لوگ ضعیف یا بیمار تھے، انہیں بھی بیل گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا تھا، باقی سب لوگ پیدل تھے۔ میرے بڑے بھائی یوسف اس وقت گورنمنٹ کالج روپڑ میں ایف۔ اے کے سال دوم کے طالب علم تھے اور گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے گھر آئے ہوئے تھے۔ میں اس وقت دسویں جماعت میں تھا۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں اور ان سے چھوٹے دو بھائی الیاس اور اشفاق تھے۔ الیاس کی عمر اس وقت پانچ سال تھی اور اشفاق تین سال کا تھا۔ دادا جان ضعیف تھے، اس لیے انہیں بیل گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔ باقی سب لوگ پیدل چل رہے تھے۔

ہمارے گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سکھ جاٹوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں مدن ہیڑی تھا اور ہمیں اسی گاؤں سے گزر کر آگے جانا تھا اور اس گاؤں والے ہمیں آگے جانے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ ہماری مدن ہیڑی والوں سے لڑائی ہو گی اور ہم ان سے لڑتے بھڑتے آگے نکل جائیں گے مگر انہوں نے کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔ ہمارے قافلے کو انہوں نے اپنے گاؤں کے باہر کوئی گھنٹا بھر روکے رکھا۔ کسی لڑائی بھڑائی کی نوبت نہ آئی۔

ایک گھنٹے بعد انہوں نے ہمیں گاؤں سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن اس ایک گھنٹے میں وہ اپنی تمام کارروائی مکمل کر چکے تھے۔ چناں چہ جب ہم مدن ہیڑی سے نکل کر آگے پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی کہ ارد گرد کے تقریباً سبھی دیہات کے سکھ جگہ جگہ راستے کے دونوں طرف موجود ہیں۔

بیل گاڑیاں قافلے کے پچھلے حصے میں تھیں اور آگے لوگ پیدل چل رہے تھے۔ سکھوں نے پہلے بیل گاڑیوں پر حملہ کیا۔ بیل گاڑیوں کے گاڑی بان بیل گاڑیوں، ان پر لدے ہوئے سامان اور ان پر سوار بوڑھوں کو اللہ کے حوالے کر کے بیل گاڑیوں سے اترے اور بھاگ کر پیدل چلنے والوں سے جا ملے۔

خود پیدل چلنے والوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ساتھ ہی بارش ہونے لگی تھی اور اس بارش نے ہم لوگوں کی گھبراہٹ اور خوف میں اضافہ کر دیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا کس کو ہوش تھا۔ سکھوں کے جتھے لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے چلے آ رہے تھے اور ہمارے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جلد از جلد کھرڑ سے کورالی کی طرف جانے والی پکی سڑک پر پہنچ جائیں یا کھرڑ شہر ہی میں داخل ہو جائیں۔ ابھی تک سب اس خیال میں تھے کہ کھرڑ چوں کہ انگریزی علاقے میں ہے اور سکھوں کے جتھے ریاست پٹیالہ کے مختلف دیہات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے وہ انگریزی علاقے میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔ یہ کسی کو بھی خیال نہیں تھا کہ کیا انگریزی علاقہ اور کیا ریاست، دونوں جگہ اس وقت مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔

بہر حال ہم گرتے پڑتے اس ندی کے قریب پہنچے جو کھرڑ کے قریب سے گزرتی تھی اور خان پور والی ندی کے نام سے مشہور تھی۔ اس ندی پر کوئی پل وغیرہ نہ تھا۔ تانگے، موٹریں اور بسیں ندی میں سے ہو کر گزرتی تھیں۔ ایک تو اس میں پانی زیادہ نہیں ہوتا تھا، دوسرے سرکنڈے اور لوہے کی جالی ڈال کر گاڑیوں کے لیے ایک مستقل راستہ بنا دیا گیا تھا۔

ہم خان پور ندی کے قریب پہنچے تو اس کے کنارے سکھوں کا ایک جتھا راستہ روکے کھڑا تھا۔ ہم وہاں سے پلٹے اور کھرڑ شہر کا

رخ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اکا دکا فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس فائرنگ کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں گھیر گھار کر کھرڑ کے اس ڈاک بنگلے تک پہنچایا جائے جہاں ایک سکھ کپتان نے ہمارے استقبال کے لیے مشین گنیں لگا رکھی تھیں۔

ہم ڈاک بنگلے کے پاس پہنچے ہی تھے کہ مشین گنوں نے تڑا تڑ فائر کھول دیا۔ اوپر سے آسمان بارش برسا رہا تھا اور سامنے سے مشین گنیں گولیوں کا مینہ برسا رہی تھیں۔ قافلے کے ایک نوجوان نے حیرت انگیز دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مشین گن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی اور وہ اس کوشش میں جان سے گزر گیا۔

اب تک ہمارے خاندان کے تقریباً سبھی لوگ ایک ساتھ تھے۔ مشین گنوں نے فائر کھولا اور درجنوں کے حساب سے لاشیں گریں تو ایک افراتفری مچ گئی۔ اس افراتفری میں سب تتر بتر ہو گئے۔ جس کا جدھر کو منہ اٹھا، نکل گیا۔ میرے ساتھ والدہ، دونوں بہنیں، سب سے چھوٹا بھائی اشفاق، دو خالائیں، ایک خالہ زاد بہن اور چند دوسری عورتیں تھیں۔ گرتے پڑتے، اٹھتے بھاگتے ہم نے گنے کے ایک کھیت میں پناہ لی۔ میرا دوسرا بھائی الیاس میرے بڑے بھائی یوسف کے ہمراہ تھا۔ ان کے ساتھ گاؤں کے دو تین اور نوجوان بھی تھے۔

جب تک فائرنگ کی آوازوں کا سلسلہ جاری رہا، ہم گنے کے کھیت میں چھپے رہے۔ فائرنگ بند ہونے کے کچھ دیر بعد باہر سے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ''باہر نکل آؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ باہر نکل آؤ، اب کوئی خطرہ نہیں۔'' ہمیں ان آوازوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، اس لیے ہم بدستور کھیت ہی میں چھپے رہے۔ مگر جب کھیت میں ہمارے پیچھے گڑبڑ سی ہوئی تو ہم گھبرا کر باہر نکل آئے۔

باہر کرپانوں، نیزوں، بھالوں اور بلموں سے مسلح سکھ پھر رہے تھے۔ ان کی کرپانیں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے نیزوں، بھالوں اور بلموں کی انیوں اور دستوں تک سے خون ٹپک رہا تھا۔ ہم کھیت سے باہر نکلے تو سکھوں کو دیکھ کر گھبرائے مگر ان کے تیور دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ شاید وہ قتل و غارت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ انہوں نے صرف ہماری تلاشی لی اور جس جس کے پاس نقد روپیہ یا زیور نام کی جو بھی چیز تھی، وہ چھین لی۔ اس کے بعد ان میں سے دو تین آدمی ہمیں اپنے ساتھ لے کر شہر کھرڑ کی طرف چل دیئے۔

اس وقت تک بارش تھم چکی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ جگہ جگہ تڑپتے، بلکتے اور سسکتے زخمی پڑے تھے۔ ان میں سے جو اٹھ کر چل سکتے تھے، انہیں ساتھ لے کر ہم لوگ ڈاک بنگلے کے سامنے ایک احاطے میں پہنچے۔ یہاں ہمارے قافلے کے بچے کچھے لوگوں کو جمع کیا جا رہا تھا اور جو زخمی تھے، ان کی برائے نام مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔

سب کی آنکھیں اپنے ان عزیزوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جو بھگدڑ میں ان سے بچھڑ گئے تھے۔ میری نظریں اپنے بڑے بھائی یوسف، خالہ زاد بھائی مصطفیٰ اور چھوٹے بھائی الیاس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک شخص الیاس کی انگلی پکڑے احاطے میں داخل ہوا۔ والدہ اسے دیکھتے ہی بازو پھیلائے آگے بڑھیں اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے زار زار روتے ہوئے اس قیامت کا حال سنایا جو یوسف اور مصطفیٰ پر ٹوٹی تھی۔

یوسف، مصطفیٰ، سلیمان اور ایک دو اور نوجوان مشین گن کے فائر کے بعد کی بھگدڑ میں ہم سے الگ ہو گئے تھے۔ الیاس کو یوسف نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ مشین گن کی فائرنگ کے ساتھ ہی قافلے والوں کی قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ سکھوں کی بن آئی تھی وہ بدحواس مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں سکھوں کے ایک جتھے نے نیزوں اور بھالوں سے یوسف، مصطفیٰ اور ان کے ساتھیوں پر وار کیا۔ یوسف نے نیزہ کھانے سے پہلے ہی الیاس کو یوں اپنے نیچے چھپا لیا جیسے مرغی خطرے کے وقت اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ سکھ یوسف، مصطفیٰ اور ان کے ساتھیوں کو زخمی کر کے آگے چلے گئے تھے۔ خاصی دیر بعد جب قتل و غارت کا سلسلہ رکا تو قریب سے گزرنے والے کسی شخص نے الیاس کو ساتھ لیا اور اسے ہمارے پاس پہنچا دیا۔ الیاس نے آہوں اور ہچکیوں کے درمیان یوسف اور مصطفیٰ پر گزرنے والی قیامت کی یہ روداد سنائی تو والدہ نے شدت غم سے باہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ہائے! میرے بیٹے! میں تیرے پاس ہوتی تو تیرے حلق میں پانی ڈالتی!''

میری خالہ ''ہائے میرے مصطفیٰ! ہائے میرے مصطفیٰ!'' کہہ کر

رو رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر شخص کسی نہ کسی کے غم میں رو رہا تھا۔ کسی کو دوسرے کا حال پوچھنے اور اظہار ہمدردی کرنے کی فرصت نہ تھی...... سبھی کے سینے غم سے چھلنی تھے۔

مگر میرے بڑے بھائی یوسف اور خالہ زاد مصطفیٰ پر گزرنے والی قیامت کی یہ روداد صرف آدھی روداد تھی۔ بقیہ آدھی روداد کہیں مہینے ڈیڑھ مہینے بعد جا کر ہمارے علم میں آئی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ خوں خوار سکھ اس وقت تو یوسف، مصطفیٰ اور ان کے ساتھیوں کو اپنی دانست میں مار کر چلے گئے تھے مگر پھر شام کو اور رات بھر وہ اور ان کے دوسرے ساتھی کھیتوں میں جھانکتے پھرتے رہے کہ کہیں کوئی ''مسلا'' چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ اس طرح دیکھتے جھانکتے وہ ظالم اس جگہ آ پہنچے جہاں یوسف، مصطفیٰ، سلیمان اور ان کے ساتھی زخمی پڑے تھے۔ ظالم سکھوں نے جب انہیں اپنے پیروں کی ٹھوکروں سے ٹٹولنا شروع کیا تو یوسف، مصطفیٰ اور ان کے دوسرے ساتھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ صرف سلیمان مردہ بنا لیٹا رہا۔ سکھوں نے اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا مگر یوسف، مصطفیٰ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہمارے لٹے پٹے قافلے کے بچے کھچے لوگ کورالی کی طرف روانہ ہوئے۔ کھرڑ سے کورالی کا فاصلہ چھ میل تھا۔ گرتے پڑتے، روتے سسکتے، آہیں بھرتے ہم نے چھ میل کا یہ فاصلہ تین چار گھنٹے میں طے کیا اور اس دوران کوئی افسوس ناک یا ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو چکا تھا، اس سے زیادہ افسوس ناک بات اور کیا ہو سکتی تھی؟ اور جو کچھ ہم پر بیت چکی تھی، اس سے زیادہ ناخوش گوار واقعہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ لٹنے والے لٹ چکے تھے۔ مرنے والے مر چکے تھے...... مشین گنیں اپنا کام کر چکی تھیں اور واہگورو کے خالصے اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔

ہم کورالی کے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ کیمپ کے بڑے دروازے کے باہر سڑک پر ہم نے اس شخص کو کھڑا دیکھا جس کے مارے جانے کی خبر سن کر ہم گھبراہٹ کے عالم میں گاؤں سے نکلے تھے۔ یہ ہمارے والد محترم چودھری شاہ نواز خان تھے۔ ہم پانچوں بہن بھائی دوڑ کر ان سے لپٹ گئے۔ مگر ان کی آنکھیں اپنے بوڑھے باپ اور جوان بیٹے یوسف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر جیسے والدہ کے اور ہمارے اترے ہوئے چہروں اور روتی ہوئی آنکھوں نے والد محترم کو بتا دیا کہ ان کے بوڑھے باپ اور جوان بیٹے یوسف نے پاکستان کے نام پر قربان ہو کر شہادت کا مرتبہ پا لیا ہے۔ شہادت کا اعزاز پانے والے صرف وہی نہیں تھے، ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ہم لوگ چوبلہ خرد سے چلے تو ہمارے اپنے گاؤں کے علاوہ سوتل، محمود پور، بڑا گاؤں اور دیگر دیہات سے آ کر ہمارے گاؤں میں پناہ لینے والے مسلمانوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مگر لٹ پٹ کر اور موت کے سمندر میں سے گزر کر جو مسلمان کورالی کیمپ میں پہنچے ان کی تعداد مشکل سے ایک ہزار ہو گی اور ان ایک ہزار میں بھی آدھے سے زیادہ بری طرح زخمی تھے۔ والد محترم نے آہستہ سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، ایک آہ بھری اور سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے نکلے اور ان کی ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑے رہے، پھر انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور مہاجر کیمپ کی طرف بڑھ گئے۔ مہاجر کیمپ میں وہ نواب علی خان، عبدالعزیز اور مسیتے خاں بھی جیتے جاگتے موجود تھے جو گاؤں سے فوجی دستہ حاصل کرنے کی خاطر آئے تھے۔

کورالی کا مہاجر کیمپ ابتدا میں بلوچ رجمنٹ کے زیر انتظام تھا۔ بعد میں اس کی جگہ گورکھا رجمنٹ کے جوانوں نے لے لی۔ کیمپ میں مقیم مہاجروں کو آٹا دال وغیرہ کی صورت میں خشک راشن دیا جاتا تھا۔ کیمپ میں ہمارے علاوہ کئی اور شہروں اور قصبات سے مسلمانوں کے قافلے آ جمع ہوئے تھے۔ مہاجروں کی تعداد بڑھی تو لالاؤں کو آٹے دال کے بڑھتے ہوئے خرچ کی فکر ستانے لگی اور انہوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ مہاجروں نے اپنے لوگوں کی تعداد زیادہ درج کروائی ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کیمپ کے تمام مہاجروں کو سڑک کے پار گراؤنڈ میں جمع کر کے ان کی گنتی کی جائے گی۔

ہم 12 ستمبر کو اس کیمپ میں آئے تھے اور اس کے کوئی بیس بائیس روز بعد ہی حکم ہوا کہ تمام مہاجر سڑک کے پار گراؤنڈ میں جمع ہوں۔ اکتوبر کے ابتدائی دن تھے اور موسم میں خاصی گرمی اور گرمی میں خاصی تیزی تھی۔ ہم لوگ دوسرے مہاجروں کے ساتھ کیمپ
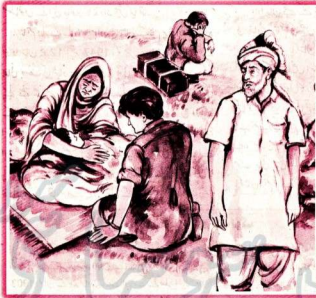
سے نکلے اور سڑک کے دوسری طرف گراؤنڈ میں جمع ہو گئے۔

یہ گراؤنڈ میرا دیکھا بھالا تھا اور اس سے میری کئی ایک خوش گوار یادیں وابستہ تھیں۔ ڈیڑھ دو سال قبل اسی گراؤنڈ میں ہمارے اسکول (کرسچین ہائی اسکول کھرڑ) کی ہاکی ٹیم کا مقابلہ خالصہ ہائی اسکول کی ٹیم کے ساتھ ہوا تھا۔ دونوں ٹیمیں بڑی مضبوط ٹیمیں تھیں۔ ہاف ٹائم سے پہلے اور ہاف ٹائم کے بعد بھی آخر تک دونوں ٹیموں میں سے کوئی بھی ٹیم گول نہ کر سکی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح فیصلے کے لیے پنلٹی کارنر دینے کا رواج نہ تھا۔ چناں چہ دونوں ٹیموں کو کھیل کے لیے مزید دس منٹ دیئے گئے تھے۔ ان دس منٹوں میں ہمارے اسکول کی ٹیم نے خالصہ اسکول کی ٹیم کے خلاف ایک گول کر کے ٹورنامنٹ جیت لیا تھا۔ اس جیت کے بعد ہماری ہاکی ٹیم اور ہمارے اسکول کے لڑکوں نے سارے گراؤنڈ کا چکر لگا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

اب پھر وہی گراؤنڈ تھا۔ اس کے اندر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مہاجروں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ ہر مہاجر کے چہرے پر پریشانی اور فکر کی لکیریں تھیں۔ ہر ایک کے دل میں طرح طرح کے اندیشے تھے۔ کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس عالم میں گرمی کی تیزی نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ میری والدہ میرے سب سے چھوٹے بھائی اشفاق کو اٹھائے ہوئے تھیں۔ اس ننھی سی جان کو پیاس نے بے حال کر رکھا تھا اور میں نے جس گراؤنڈ میں کبھی خوشی سے چکر لگائے تھے، اب اسی گراؤنڈ میں پانی کی تلاش میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ اب وہ میدان ہمارے لیے کربلا کا میدان بن گیا تھا۔ بڑی دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد پانی میسر بھی آیا تو جوہڑ کا گندہ اور ناصاف پانی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کا چلو بنا کر وہ پانی لیا اور والدہ کے پاس پہنچا۔ پیاس کی تکلیف سے اشفاق کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ والدہ نے چلو سے تھوڑا سا پانی لیا اور اشفاق کے حلق میں ٹپکایا۔ دوسرے ہی لمحے اسے ہچکی آئی، اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ معصوم جان اپنی ماں ہی کے ہاتھوں میں شہید ہو گئی۔

کچھ دیر بعد لوگ کیمپ میں واپس جانا شروع ہوئے۔ والدہ نے معصوم شہید اشفاق کی لاش اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھی تھی مگر ان کی آنکھیں خشک تھیں۔ غم کی شدت نے آنسوؤں کے چشمے خشک کر دیئے تھے۔

بوڑھے باپ اور جوان بیٹے کی شہادت کے بعد والد محترم کو اپنے کمسن اور معصوم بیٹے کی شہادت کا صدمہ بھی دیکھنا پڑا۔ صدمہ سخت تھا مگر وہ تو صبر و رضا کی تصویر بن کر خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکا چکے تھے۔

کورالی کے مہاجر کیمپ میں ہمارا قیام 12 ستمبر 1947ء سے 13 نومبر 1947ء تک رہا۔ کیمپ کی سختیاں جھیل کر ہم بالآخر 13 نومبر 1947ء کو ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے پاکستان روانہ ہو گئے تھے۔ 15 نومبر 1947ء کو ہم نے پاکستان کے خوابوں کی تعبیر اور ان کی طویل جدوجہد کی منزل تھی اور جس کے لیے لاکھوں

مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

تاہم ہمارے لیے اسلام اور پاکستان کے نام پر شہادتوں کی لہو لہو داستان جو 12 ستمبر 1947ء کو میرے دادا جان اور بڑے بھائی یوسف کی شہادت سے شروع ہوئی تھی، اکتوبر 1947ء کے پہلے ہفتے میں میرے سب سے چھوٹے بھائی اشفاق کی آخری ہچکی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی طرح وہ بھی اسلام اور پاکستان کی خاطر جام شہادت نوش کر گئے تھے...... یقیناً ان شہیدوں کی روحیں آج ہم سے یہ سوال کرتی ہیں کہ اے پاکستان کے باسیو! ہم نے جس اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، تم اسے کیوں بھول گئے ہو؟

دادا جان جیسے کتنے ہی بزرگوں کی بوڑھی ہڈیوں نے پاکستان کی بنیادیں قائم کی تھیں...... یوسف جیسے ہزاروں لاکھوں جوان اپنے لہو سے شجر پاکستان کی آبیاری کرتے رہے تھے...... اشفاق جیسی ان گنت جانیں اسلام اور پاکستان پر نچھاور ہوگئی تھیں...... ان سب کی قربانیوں کا دھیان آتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں تو ان شہیدوں کی قربانیوں کے طفیل...... اور اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج پاکستان میں بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، مسلمان مسلمان کا خون بہا رہا ہے تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں...... دادا جان! یوسف! اشفاق! اے شہیدانِ پاکستان! ہم تم سے شرمندہ ہیں...... بے حد شرمندہ ہیں!

☆☆☆

کام یاب لوگ

ان کی تعلیم میٹرک نہ تھی۔ وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں چن کر کھاد فیکٹری میں فروخت کرتے۔ کبھی لوہے کے ٹکڑے چنتے اور کباڑیے کے ہاں فروخت کر دیتے۔ بعد میں انہوں نے سائیکل مرمت کے لیے ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ ان کا ارادہ بلند تھا۔ وہ باہمت اور محنتی تھے۔ 17 ستمبر 1903ء کو ان کے بلند ارادوں، ہمت اور محنت نے صلہ پا لیا۔ انہوں نے انسانی تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا۔ انسان ہوا میں اڑنے کے قابل ہوگیا تھا۔ اور رائٹ برادران عظیم انسانوں کی فہرست میں شامل ہوکر لازوال بن گئے تھے۔

یہ جرمنی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ انتہائی شرمیلا، کند ذہن بلکہ مخبوط الحواس، اساتذہ اس سے تنگ تھے اور والدین ناامید۔ اس کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ وہ بغیر استری کے پرانے کپڑوں میں گھومتا پھرتا۔ اس نے کبھی شیونگ کریم استعمال نہ کی بلکہ وہ نہانے والا صابن استعمال کر کے شیو بھی کر لیتا۔ ایک دن وہ برلن میں سفر کر رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے کرایہ لیا اور کچھ ریزگاری واپس کی۔ اس نے ریزگاری لی اور کنڈیکٹر سے کہا کہ تم نے کم پیسے واپس کیے ہیں۔ کنڈیکٹر بولا دوبارہ گنو۔ جب دوبارہ اس نے گنی تو پوری نکلی۔ کنڈیکٹر غصے سے بولا۔ ''تمہیں گنتی بھی نہیں آتی، جاؤ۔''

وہ کند ذہن مخبوط الحواس اور نالائق بچہ جسے کنڈیکٹر گنتی نہ آنے کا طعنہ دے رہا تھا۔ جدید دور کا سب سے بڑا حساب دان اور سائنس دان بن گیا۔ اس کی محنت اور ہمت نے اسے عظیم بنا دیا آج دنیا اسے نیوٹن کے نام سے جانتی ہے۔

اسکول میں وہ صرف پرائمری تک پڑھا۔ آج وہ ایم اے کرنے والوں کو پڑھاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب اس کے پاس ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ اس کے کپڑے پھٹے پرانے ہوتے اور جوتوں میں بڑے بڑے سوراخ۔ پھر ایک وہ وقت آیا کہ اس نے انعام میں ملنے والے سات ہزار پونڈ لینے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اسے مزید دولت کی ضرورت نہ تھی۔ دولت کے ساتھ اس قدر شہرت ملی کہ نوبل انعام اس کی شہرت میں مزید اضافہ نہ کر سکتا تھا۔ دنیا آج اسے جارج برنارڈ شاہ کے نام سے جانتی ہے۔ جو پہلی جنگ عظیم میں ایمبولینس کا ڈرائیور تھا لیکن 1945ء میں نوبل انعام کا حق دار بن گیا۔

عظیم مسلمان سائنس دان جس کی پیدائش 737ء میں ہوئی۔ وہ ایک معمولی گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کا والد دوائیں بیچتا تھا۔ اس کے والد کو کسی جرم میں پھانسی کی سزا ہوگئی اور وہ یتیم ہوگیا بچپن میں اس کی تعلیم معمولی رہی لیکن محنت اور ہمت سے وہ علم کیمیا کا بانی بن گیا۔ آج دنیا اسے جابر بن حیان کے نام سے جانتی ہے۔

ایڈیسن نے صرف تین مہینے اسکول میں پڑھا۔ اس لیے کہ اس کے اساتذہ اسے مزید پڑھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ بچہ کمزور ذہن کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا۔ ڈاکٹروں کی اس کے بارے میں رائے تھی کہ یہ عمر کے کسی حصے میں بالکل کند ذہن ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وہ بل جمع کرانے کے لیے قطار میں کھڑا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو کلرک نے اس کا نام پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے اپنا نام بھول چکا تھا۔ اتفاق سے اس کا پڑوسی قریب موجود تھا۔ وہ صورت حال سمجھ گیا اور کلرک کو جا کر اس کا نام بتایا لیکن اس کے باوجود اس نے محنت کی اور ہمت سے کام لیا تو وہ دنیا کا عظیم سائنس دان بن گیا۔ (شیخ عبدالحمید عابد)

قومی پرچم کے آداب

ہمارا پرچم ، یہ پیارا پرچم
یہ پرچموں میں حسین پرچم
عطائے رب کریم پرچم

☆ قومی پرچم صبح کے وقت لگائیں اور اسے شام ہونے سے قبل اتار لیں۔ رات کی تاریکی میں ہرگز مت لہرائیں۔
☆ مستول(mast) پر لگاتے ہوئے اسے بائیں طرف یعنی سفید حصہ کی جانب سے باندھیں۔
☆ پرچم کو زمین پر مت گرائیں اور کسی بھی قسم کی گندگی سے محفوظ رکھیں۔
☆ پرچم کو کبھی بھی عمودی رخ یا الٹا کر کے مت لگائیں نہ ہی ہلال اور ستارے کا رخ بائیں جانب ہو۔
☆ صوبائی، فوجی یا دیگر اداروں کے پرچموں کے ساتھ لگانے کی صورت میں قومی پرچم ہمیشہ بلند رکھیں۔
☆ پرچم پر کسی قسم کی تحریر یا تصویر نہ لگائیں۔ بازار میں ملنے والے پرچم جن پر تصاویر بنی ہوں۔ مت خریدیں۔
☆ آگ یا کسی بھی قسم کی نقصان دہ چیز سے پرچم کو دور رکھیں۔
☆ پرچم کو زمیں دفن مت کریں۔ پرچم والے تابوت کی تدفین سے قبل پرچم کو نکال لیں۔

پیارے بچو! قومی پرچم کے متعلق ان اصولوں پر خود بھی عمل کیجئے اور دوستوں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ کیوں کہ اگر ہم اپنے پرچم کی تعظیم نہیں کریں گے تو پھر اقوام عالم بھی اسے روندنے کے درپے ہو جائیں گے۔ لہٰذا آج شام سے قبل اپنے پرچم کو ضرور اتار لیں۔ اس طرح جھنڈیاں نہ لگائیں کہ وہ زمین پر گر جائیں۔ اگر گر جائیں تو خراب ہونے سے پہلے اتار لیں۔

جھنڈیوں اور پرچم کو کسی صندوق یا الماری میں اچھی طرح پیک کر کے محفوظ کر لیں۔ لہٰذا اگلے یوم آزادی پر یہی جھنڈیاں اور پرچم استعمال کریں۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اگست 2017ء ہے۔

نام: ____________
شہر: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اگست 2017ء ہے۔

نام: ____________
مقام: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

اگست کا موضوع "یوم پاکستان" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/اگست 2017ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________
مقاصد ____________
موبائل نمبر: ____________

ط	ص	گ	ف	ن	خ	ج	ی	ن	ج
ش	ت	ر	ی	ح	ف	ا	ع	ا	ت
ع	م	ذ	ت	ل	ا	خ	ق	ط	ن
ج	ک	غ	س	گ	ل	ب	ف	ل	و
ت	ر	ص	و	چ	خ	ا	ظ	س	خ
ق	ک	م	د	د	ڑ	ر	ض	م	ک
ط	ٹ	و	ش	ت	ن	ا	م	ض	ل
ض	ح	ک	و	م	ت	ج	ت	ن	ط
و	ی	ل	س	ل	س	م	ٹ	ع	ض
ن	ش	ے	ل	ڈ	ق	ل	ا	و	س

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

اخبار، حکومت، سوال، دوست، ضمانت، حیرت، سلطان، خلاف، مسلسل، کرکٹ

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ پاکستان کا پرچم کس نے ڈیزائن کیا؟

i۔ صادقین ii۔ شاکر علی iii۔ سید امیر الدین کدوائی

2۔ قومی ترانہ حفیظ جالندھری کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

i۔ شاہنامۂ اسلام ii۔ چراغِ سحر iii۔ نغمۂ ساز

3۔ قومی ترانے کی دھن کس نے ترتیب دی؟

i۔ عبدالکریم چھاگلہ ii۔ رفیق غزنوی iii۔ سرور نیازی

4۔ پورے قومی ترانے کا دورانیہ کتنا ہے؟

i۔ ایک منٹ 20 سیکنڈ ii۔ ایک منٹ 22 سیکنڈ
iii۔ ایک منٹ 23 سیکنڈ

5۔ پہلی بار قومی ترانہ ریڈیو پاکستان سے کب نشر ہوا؟

i۔ 12 اگست 1954ء ii۔ 13 اگست 1954ء
iii۔ 14 اگست 1957ء

6۔ قومی ترانے میں عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ کون سی زبان کے الفاظ ہیں؟

i۔ فرانسیسی ii۔ ترکی iii۔ کوئی زبان نہیں

7۔ قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کب پیدا ہوئے؟

i۔ 14 جنوری 1900ء ii۔ 14 جنوری 1901ء
iii۔ 14 جنوری 1902ء

8۔ حفیظ جالندھری پاکستان کے کس شہر میں فوت ہوئے؟

i۔ کراچی ii۔ لاہور iii۔ سیال کوٹ

9۔ پاکستان کا نام کس نے تجویز کیا؟

i۔ مولانا ظفر علی خان ii۔ چوہدری رحمت علی iii۔ مولانا محمد علی جوہر

10۔ قومی ترانہ لکھنے والوں کے لیے کتنے روپے مالیت کا انعام دینے کا اعلان ہوا تھا؟

i۔ 10 ہزار ii۔ 20 ہزار iii۔ 30 ہزار

1- کوہ صفا 2- صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا 3- یکم جولائی 1948ء 4-13550 فٹ 5- لیتھیم 6- ہجرت 7- انسانی معاشرت کا علم 8- علامہ اقبالؒ 9- 31 جولائی 1893ء 10- لائل پور

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ ثانیہ امتیاز، لاہور (150 روپے کی کتب)
☆ نور الھدیٰ ازل، میانوالی (100 روپے کی کتب)
☆ ایمن گل، میانوالی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
مریم ملک ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ محسن کبریا، سرائے عالمگیر۔ محمد ارسلان رضا، لودھراں۔ شیراز عالم، ساہی وال۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔ ربیعہ توقیر، کراچی۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ فاطمہ احمد، راول پنڈی۔ سارا ارشد، سرگودھا۔ پالوسین، کمالیہ۔ حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ محمد صہیب علی، کراچی۔ ابوہریرہ، مانانوالہ۔ شازیہ اختر، فیصل آباد۔ ماریہ اعظم، قلعہ دیدار سنگھ۔ بختاور معزز علی، لاہور۔ مریم عثمان، راول پنڈی۔ محمد مجیر خان، ڈیرہ غازی خان۔ علیشہ عدنان، اسلام آباد۔ منال عاصم، لاہور۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ محمد نبیل صدیقی، لاہور۔ صدف آسیہ، کراچی۔ طلحہ قطب، لاہور۔ نفیسہ فاطمہ قادری، کاموکی۔ سید حماد حیدر، ٹیکسلا۔ محمد ولید، لاہور۔ عائشہ فاطمہ قادری، کاموکی۔ ایمان لطیف، لاہور۔ محمد ہاشم خضر، اسلام آباد۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ آیت اللہ ورک، لاہور۔ بشریٰ حسینی، کلورکوٹ۔ مریم رفیق، لاہور۔ محمد قاسم سرباز، ڈیرہ غازی خان۔ اقصیٰ خالد، اسلام آباد۔ ذیشان بن نذیر، فیصل آباد۔ فرحین انور، اسلام آباد۔ محمد قمر الزمان، خوشاب۔ رضوان اشہد، پشاور۔ ولید اشرف، لاہور۔ سید بدر السلام، میرپور آزد کشمیر۔ فاطمہ اعجاز، اسلام آباد۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ صفی اللہ، قلعہ دیدار سنگھ۔ گل فاطمہ، راول پنڈی۔ زنیرہ بانو، کمالیہ۔ طیبہ ملک، گوجرانوالہ۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ علینا اختر، کراچی۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ فرحان ظفر۔

اوجھل ہیں

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

میری زندگی کے مقاصد
عمر مشتاق موہل، واہ کینٹ
ایئرفورس جوائن کروں گا۔ پاکستان سے دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گا اور لوگوں کی خدمت کروں گا۔
سمیعہ افگار، شیخوپورہ
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے ملک اور والدین کا نام روشن کروں گی۔
محمد قاسم، لاہور
فوجی بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
ایاز احمد، لاہور
میں میڈیکل فیلڈ میں جاؤں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔
عفاف خان، بہاول پور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بن کر قوم و ملت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔
حفصہ فرقان، لاہور
میں پائلٹ آفیسر بن کر اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔
ثمامہ شبیر، گجرات
میں ایئرفورس میں جا کر اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔
مریم طارق، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر ملک کی خدمت کروں گی۔
سید علی عمار، وزیر آباد
میں بڑا ہو کر فائٹر پائلٹ بنوں گا اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔
حرا عروج، سرگودھا
میں قرآن پاک حفظ کروں گی اور قرآن کی تعلیم کو عام کرنا، اس پر عمل کرنا میرا مقصد ہے۔
علی احمد، بھلوال
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔
اکرام خان، ڈیرہ غازی خان
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک سے دشمنوں کا خاتمہ کروں گا۔
حضرت امین، پشاور
میرا جینا ایک اللہ کے لیے ہے۔
محمد حمید، بھلوال
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔
عبدالوہاب، بھلوال
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔
اسامہ بن خرم، گوجر خان
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت اور ملک کا نام روشن کروں گا۔
محمد طلحہ بٹ، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر پولیس آفیسر بنوں گا۔
محسن رضا، بھلوال
میں مائیکروسافٹ انجینئر بن کر اپنے ملک اور والدین کی خدمت کروں گا۔
محمد حاشر علی، مظفر گڑھ
میں بڑا ہو کر کور کمانڈر بنوں گا اور اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔
نعمان صفدر، لاہور
میں انجینئر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔
تصور حسین، جوہر آباد
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
شہزاد حسین، وہاڑی
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔
سعد رحمن، گوجرانوالہ
الیکٹریکل انجینئرنگ میں ملک کا نام روشن کروں گا۔
محمد معاذ مصطفوی، بہاول پور
میری زندگی کا مقصد دینِ اسلام کی سرفرازی اور ساری دنیا میں نظامِ مصطفیٰ کا نفاذ ہے۔
ذنیرہ جاوید، لاہور
میں بڑی ہو کر مکینیکل انجینئر بنوں گی اور ملک کی فلاح و بہبود کے منصوبے بناؤں گی۔

ایمان کی مضبوطی

ایک بار شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک مہیب بادل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک برگزیدہ صورت بن گیا پھر اس سے ایک گونج دار آواز آئی: ''اے عبدالقادر! میں تیرا رب ہوں (نعوذ باللہ)۔ تو نے عمر بھر میری اتنی خدمت کی۔ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ میں تیری آئندہ زندگی کی عبادت معاف کرتا ہوں۔''
شیخ عبدالقادرؒ نے فرمایا: ''تو میرا رب نہیں شیطان ملعون ہے اگر نماز معاف ہوتی تو آپؐ کی ہوتی کیوں کہ ان سے زیادہ عبادت کسی نے نہ کی ہوگی اور ان سے زیادہ اللہ کو اور کون پیارا ہوگا۔''
اس کے بعد عبدالقادرؒ نے لاحول پڑھی شیطان ذلیل ہو کر بھاگا اور کہنے لگا: ''عبدالقادر تجھے تیرا علم بچا گیا ورنہ اس حربے سے میں 70 زاہدوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔''
(عائشہ خالد، راول پنڈی)

سنہرے اصول

1- جب تم کسی کو اس کی دولت کی وجہ سے عزت دینے لگو تو سمجھ لو کہ تم نے اپنا ایمان گنوا دیا۔
2- جس قوم میں غدار پیدا ہونے لگیں اس قوم کے مضبوط قلعے بھی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔
3- اگر موت کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو موت سے پہلے اپنے رب کی مرضی کی زندگی گزار لو۔
4- جنہیں خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے انہیں رات چھوٹی لگتی ہے اور جنہیں خواب پورا کرنا اچھا لگتا ہے انہیں دن چھوٹا لگتا ہے۔
(حبیب الرحمان، ننکانہ صاحب)

نماز

ہم سب پر ہے فرض نماز
اللہ کا ہے قرض نماز
دنیا جب آغاز ہوئی
دین کا رکن نماز ہوئی
بے شک سارے کام کرو

پانچوں وقت نماز پڑھو
سب انسان برابر ہیں
کم تر اور نہ بدتر ہیں
ایک دن سب کو جانا ہے
منہ اللہ کو دکھانا ہے
جب ہم سب کی پیشی ہو
پہلے پوچھ اسی کی ہو
نیکی ہمیں سکھاتی ہے
مشکل میں کام آتی ہے
ساری بدیوں سے روکے
پڑھو نماز وضو کر کے
مسلم اللہ دین اسلام
رب کو سجدے سے ہے کام
(انوشہ فاطمہ، لاہور)

نمکین نظم

میری زندگی میں جب بھی کیمسٹری کا نام آتا ہے
زندگی کا میرے لیے بہت ہی مشکل مقام آتا ہے
فزکس سوچنے بیٹھ جاتے ہیں ہم بھی نیوٹن کی طرح
سر پر جب بھی کہیں سے کوئی بھی آم آتا ہے
روٹھی نیند پھر ہمیں منانے کو چپکے سے آ جاتی ہے
سامنے میرے جب بھی میتھ کا مشکل سا کام آتا ہے
بائیو تو رگِ جاں سے عزیز ہے ہمیں دوستو
اسی کا سن کر ہی ہمیں تھوڑا سا آرام آتا ہے
آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ہماری پھر کبوتر کی طرح
تماضر جب بھی سامنے کبھی اپنا انجام آتا ہے
(تماضر ساجد، صادق آباد)

عدل کی اعلیٰ مثال

عدل کی اعلیٰ مثال سیدنا عمرؓ کی ہے کہ آپؓ خطبہ کے لیے

کھڑے ہوئے تو ایک شخص نے کہا ہم آپؓ کی بات سنیں گے نہ عمل کریں گے کیوں کہ آپؓ نے اپنے حصے کا زیادہ کپڑا لیا ہے۔ تمام مسلمانوں کے حصے میں ایک چادر آئی تھی۔ آپؓ لمبے قد کے ہیں۔ ایک چادر میں آپؓ کا لباس کیسے تیار ہو سکتا ہے۔ آپؓ اس وقت بائیس لاکھ مربع میل کے حکمران تھے۔ چاہتے تو اس آواز کو دبا سکتے تھے لیکن آپؓ نے ایسا نہ کیا۔ اپنے بیٹے عبداللہ سے فرمایا کہ وہ اس سوال کا جواب دیں۔ آپؓ کے بیٹے نے کہا میں نے اپنے حصے کی چادر والد محترم کو دی تھی۔ اس طرح ان کا لباس بنا۔ تاریخ اسلامی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

اقوال زریں

☆ ہر کسی سے خندہ روی سے پیش آنا بڑی نیکی ہے۔
☆ صدق یقین کے ساتھ سو رہنا اس نماز سے کہیں زیادہ اچھا ہے جو شک کے ساتھ ادا کی جائے۔
☆ جس شخص کی زبان پر اس پر حکمران ہو تو وہی اس کی ہلاکت اور موت کا فیصلہ کرتی ہے۔
☆ مصیبت کی جڑ کی بنیاد انسان کی گفتگو ہے۔
☆ عاقل کی دنیا طلبی جاہل کی ترک دنیا سے ہے۔
☆ کام یابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔
☆ انسان کی بہترین اور مونس کتابیں ہیں۔
☆ جدوجہد کا دامن مت چھوڑو اور ہر وقت کوشش کیا کرو۔ ایک دن کام یابی ہم کنار ہوگی۔
☆ آزاد وہ ہے جسے طمع غلام نہ بنالے۔
☆ اللہ کے راستے پر چلنے والوں کا پہلا مقام توبہ و استغفار ہے۔
☆ بھوک نور ہے، بھوک سے زیادہ کھانا آگ ہے۔
☆ نفسانی خواہشوں کو روکنا جہاد اکبر ہے۔ (شاہد سلیم، کچی موڑ)

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆اپنے آپ کو پرکھے بغیر زندگی گزارنا بے مقصدی بات ہے۔ (سقراط)
☆علم حاصل کرنے کے لیے خود کو شمع کی طرح پگھلاؤ۔ (شیخ سعدیؒ)
☆زندگی کی مصیبتیں کم کرنا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ مشغول و مصروف رہو۔ (جنید بغدادیؒ)
☆کسی کے عیب تلاش مت کرو کہ دوسرا تیرے عیبوں کی جستجو نہ کرے۔ (ارسطو)

☆میری دو تمنائیں ہیں اوّل یہ کہ خدا کا کلام سنتا رہوں دوم خدا کا کوئی بندہ دیکھتا رہوں۔ (بوعلی سینا)
☆بُرا نہ ہونا بھی نیکی ہے۔ (ابن جوزی)
☆زندگی کی سب سے بڑی کام یابی نفس پر قابو پانا ہے۔ (ارسطو)
☆اگر مجھ سے خدا کا تصور چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ (ابوبکر بن داؤد)
☆ جس بیماری کا سبب معلوم ہو اس کی شفا بھی موجود ہے۔
(دختر فضل کریم، راول پنڈی)

علم اچھا یا دولت اچھی

☆ دولت فرعونوں کا ورثہ ہے اور علم انبیاء کا عطیہ۔
☆ دولت کی حفاظت تم کرتے ہو جب کہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔
☆ جس کے پاس دولت ہو اس کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں اور جس کے پاس علم ہو اس کے بہت سے دوست ہوتے ہیں۔
☆ دولت بانٹی جائے تو کم ہوتی ہے علم بانٹا جائے تو بڑھتا ہے۔
☆ دولت مند کنجوسی کی طرف مائل رہتا ہے اور عالم فیاضی کی طرف۔
☆ دولت چرائی جا سکتی ہے جب کہ علم چرایا نہیں جا سکتا۔
☆ دولت محدود ہے اس کا حساب رکھا جا سکتا ہے اور علم لامحدود ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔
☆ دولت نے فرعون اور نمرود جیسے خدائی کا دعویٰ کرنے والے پیدا کیے جب کہ علم نے انسان کو سچے معبود سے متعارف کرایا۔

خشیت الٰہی

(اللہ کا خوف)

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: ''با خدا میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں درخت ہوتا، جسے جانور کھا لیتے یا لوگ اسے کاٹ ڈالتے۔''
☆ حضرت عمر فاروقؓ جب تلاوت قرآن مجید میں کوئی آیتِ عذاب پڑھتے تو مارے خوف کے ایسے گرتے کہ لوگ روز آپ کی عیادت کو آیا کرتے تھے۔
☆ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہر رات فقہاء کو جمع کرتے اور موت و قیامت کا ذکر کرتے۔ پھر اس قدر روتے کہ گویا ان کے سامنے کوئی جنازہ پڑا ہو۔ (کظیمہ زہرہ، لاہور)

☆☆☆

اے میرے آزاد وطن

پاکستان پاکستان

پاک زمیں! بے باک زمیں

شاد وطن آباد وطن

اے میرے آزاد وطن!

تیرے دریا گیت ہمارے سونے چاندی کے فوارے

کھیت سنہرے جنگل پیارے اپنی عظمت اپنی شان

پاکستان پاکستان

پاک زمیں! بے باک زمیں

شاد وطن آباد وطن

اے میرے آزاد وطن!

تیرا پرچم سب سے پیارا صدیوں سے عنوان ہمارا

بڑھتا چاند، چمکتا تارا اپنی عزت، اپنی آن

پاکستان پاکستان

پاک زمیں! بے باک زمیں

شاد وطن آباد وطن

اے میرے آزاد وطن!

تو محکم تعمیر ہماری تو روشن تصویر ہماری

تو زندہ تقدیر ہماری اپنا دین اپنا ایمان

پاکستان پاکستان

پاک زمیں! بے باک زمیں

شاد وطن آباد وطن

اے میرے آزاد وطن!

سید ضمیر جعفری

ناچنے والا پودا

اپنی پتیوں (Leaf lets) کی وجہ سے یہ پودا ناچنے والا کہلاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام "Codariocalyx Motorius" جبکہ خاندان "Fabaceae" ہے۔ اس پودے کو ٹیلی گراف پلانٹ بھی پکارا جاتا ہے۔ کیوں کہ دیکھنے میں اس کے پتوں کی

حرکات سیمافور ٹیلی گراف (Semaphore Telegraph) کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ پودا بنگلہ دیش، کمبوڈیا، بھوٹان، انڈونیشیا، چائنہ، لاؤس، بھارت، ملائشیا، میانمر (پرانا نام برما)، سری لنکا، تائیوان اور پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہلکے جامنی رنگ کے پھول پیدا کرتا ہے۔ ہر پتا (Leaf) دو چھوٹے پتوں (Leaf lets) پر مشتمل ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ سورج کی روشنی اکٹھی کرنے کے لیے ہارمونز کی وجہ سے گھومتے ہیں۔ منظر بنتا ہے کہ پودا محو رقص ہے۔ اسی لیے یہ بہ طور زیبائشی پودے (ornamenatal Plants) گھروں میں لگائے جاتے ہیں۔ اس کے پتوں اور جڑوں سے کیمیائی مادے حاصل ہوتے ہیں جو ادویات کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں۔

سنہری مچھلی

گھروں میں ایکوریم میں پالی جانے والی مچھلی گولڈ فش (Gold fish) یا سنہری مچھلی کہلاتی ہے۔ اسے عربی میں 'سمک ذھبی'' اور فارسی میں ''ماہی قرمز'' کہتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام

"Carasslus Auratus" ہے۔ اس کے خاندان کو "Cyprinidae" کہتے ہیں۔ یہ مچھلی مشرقی ایشیاء میں قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے جب کہ دنیا بھر میں خوب صورتی کے باعث پالی جاتی ہے۔ اس مچھلی کا رنگ سنہرے پن پر سفید، پیلا، نارنجی، سرخ، بھورا یا سیاہ بھی ہوسکتا ہے۔ اورنج کلر کی مچھلی کو لیمن گولڈ فش کہا جاتا ہے۔ لگ بھگ 4 سے 9 انچ تک ان کی جسامت ہوتی ہے۔ یہ مچھلی سرخ، سبز، نیلے اور الٹراوائیلٹ (Ultraviolet) رنگوں میں تمیز کر سکتی ہے۔ حشرات، آبی کیڑے اور الجی (Algae) ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔ مادہ مچھلی جو انڈے دیتی ہے ان میں سے 48 سے 72 گھنٹوں میں بچے نکل آتے ہیں۔ جنہیں "FRY" کہا جاتا ہے۔ 7 دن بعد ان کی بحیثیت مچھلی شناخت شروع ہو جاتی ہے۔ پانی میں

ڈینگی مچھر اور دوسرے مچھروں کے لاروے کھانے کی وجہ سے ان مچھلیوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ایران، امریکہ، جاپان، برطانیہ وغیرہ میں گولڈفش گیم و کھلونے اور Badges پر بھی سنہری مچھلیاں بنی ہوتی ہیں۔

بورک ایسڈ

بوک یا بورک ایسڈ سفید سفوف نما کیمیکل ہے جو بچے کیرم بورڈ پہ ڈال کر کھیلتے ہیں۔ بورک ایسڈ کو ہائیڈروجن بوریٹ اور "Acidum Boricum" بھی کہتے ہیں۔ یہ کمزور ایسڈ ہے جو جراثیم کش پاؤڈر، حشرات کو مارنے، انفکشن ختم کرنے اور چکناہٹ کی وجہ سے کیرم بورڈ کے تختے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا کیمیائی فارمولہ "H_3BO_3" ہے یہ پانی میں حل پذیر ہے۔ یہ

آتش فشاں چٹانوں اور سمندری پانی میں بھی ملتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ ایسڈ پھلوں (Fruits) میں بھی موجود ہے۔ کرسٹل کی شکل میں "Wilhelm Homberg" نے 1702ء میں متعارف کروایا۔ کیمیائی طور پر بورک ایسڈ بوریکس (Borax) اور نمک کے تیزاب (Hydrochloric Acid) کے ملنے سے بنتا ہے۔ بورک ایسڈ کو کھانے سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اور یہ زہریلا پن پیدا کرتا ہے۔ شیشہ سازی، سرامکس، ادویات، جیولری وغیرہ کی صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ زخموں کو دھونے سے انفکشن ختم کرتا ہے کیوں کہ یہ بیکٹیریا کو ہلاک کر دیتا ہے۔

فلم

فلم (Film) کو مووی (Movie) بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل تصاویر کو اتنی تیزی کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے کہ کردار و اداکار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فلم کو ایک شفاف سطح پر دکھاتے ہیں جسے پردہ یا سکرین کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں مووی پروجیکٹر کے ذریعے فلم دکھائی جاتی تھی مگر اب جدید ترین ڈیجیٹل ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے۔ فلم بنی ایک فن، صنعت اور شوق بن گیا ہے۔ 1870ء کی دہائی میں پہلی مرتبہ ایڈورڈ مے برج

"Eadweard Muybridge" نے متحرک فلم متعارف کروائی۔ جبکہ ٹکٹ لے کر فلم دیکھنے کی ابتداء 1895ء میں امریکہ سے ہوئی۔ جوں جوں کیمرے جدید ہوئے فلم بھی انڈسٹری بنتی گئی۔ 1932ء میں پہلی بار کارٹون فلم رنگوں کے ساتھ پیش کی گئی۔ دنیا کے ہر موضوع پر بچوں اور بڑوں کو فلم دکھانے کے لیے سینما گھر تعمیر ہوئے۔ پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' تھی جو 7 اگست 1948ء کو ریلیز ہوئی۔ پاکستان کی پہلی سلور جوبلی فلم ''دو آنسو'' تھی۔ بھارت، امریکہ، ایران، پاکستان، چین وغیرہ فلمیں بنانے والے بڑے بڑے ممالک ہیں۔

☆☆☆

اب تم ہی بتاؤ کہ کہاں سر کو چھپاؤں
ہنستا ہے شرر میرے نشیمن کو جلا کر
(منور علی انصاری، کلور کوٹ)

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
☆
حقیقت کھل گئی حسرتؔ ، ترے ترکِ محبت سے
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں
☆
جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ چلے ہیں
(خدیجہ تحریم)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک کی جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
☆
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو !
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(احور کامران، لاہور)

اظہار دردِ دل کا نام تھا شاعری
یاران نے اسے فن بنا لیا
☆
میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی
(مائرہ شاہد، رائے ونڈ)

خطا جیسی بھی ہو لیکن ازالہ بھی تو ممکن ہے
جسے مجھ سے شکایت ہو اسے کہنا ملے مجھ سے
☆
یہ جو ہم نا احساس میں جلتے ہوئے لوگ
ہم نے زمیں زاد نہ ہوتے تو ستارے ہوتے

ہائے آداب محبت کے تقاضے ساغر
لب کھلے اور شکایات نے دم توڑ دیا
☆
خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں
(ارم شہزادی، خانیوال)

کانٹوں کو مت نکالو چمن سے کہ باغباں !
یہ بھی گلوں میں پلے ہیں بہار میں
(حافظ عمیس اقبال، خانیوال)

فرصت اگر ملے تو سمجھنا مجھے ضرور ......
میں تمہاری الجھنوں کا مکمل جواب ہوں
(ماریہ اعظم، حفصہ اعظم، شائستہ، قلعہ دیدار سنگھ)

بکھر رہے ہیں مری زندگی کے تمام ورق
نہ جانے کب کوئی آندھی اڑا کے لے جائے
میں کب تک دوسروں کے دکھ سنبھال کے رکھوں فرازؔ
جس جس کے ہیں وہ نشانی بتا کے لے جائے
(محمد احمد، لاہور)

ہماری کوہ کنی کے گئی ہیں معیار
پہاڑ کاٹ کے رستے بنائیں گے ہم
☆
بخت سے کوئی شکایت نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے
(کظیمہ زہرہ، لاہور)

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
جھگڑے سارے انا کے ہوتے ہیں
☆
زمانہ اس قدر قائل ہوا فیض جھوٹوں کا
جو سچ کہتے ہیں ...... ان کی ایک بھی مانی نہیں جاتی
(بشریٰ اصغر، کوئٹہ)

ضرب المثل کہانی

شرم سے پانی پانی ہونا

زبیدہ سلطانہ

اس دن امتحان کا نتیجہ نکلا تھا۔ سب بچے خوشی سے اچھلتے کودتے گھر آئے اور پاس ہو جانے کی خوش خبری سنائی، جسے سن کر سب خوش ہوئے اور بچوں کو شاباش دی مگر دیکھا تو حامد سب سے پیچھے منہ لٹکائے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ ماں دیکھ کر پریشان ہو گئی اور پوچھا:

''کیا بات ہے حامد، تمہیں کیا ہوا؟'' کیوں کہ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ حامد فیل ہو جائے گا۔

حامد سر جھکائے خاموش کھڑا انگلیاں مروڑ رہا تھا۔ چھوٹے بھائی نے بتایا:

''فیل ہو گئے ہیں...... ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کو بہت ڈانٹ پلائی ہے۔''

''ڈانٹ نہ پلاتے تو کیا شاباش دیتے اس نالائق کو؟ شرم تو نہ آئی ہو گی پورے اسکول کے سامنے ڈانٹ کھاتے ہوئے!'' ابو نے غصے سے کہا۔

''مگر یہ فیل کیسے ہو گیا؟ ٹیوشن بھی پڑھتا تھا، خود بھی محنت کرتا تھا......!'' امی پریشان ہو کر بولیں۔

''واہ میاں! تم نے تو حد کر دی، چھوٹے سب بھائی بہنیں پاس ہو گئے اور تم فیل...... شرم آنی چاہیے تمہیں۔'' چچا نے بھی حامد کو پھٹکارا۔ وہ مجرم بنا سب کے سامنے کھڑا تھا۔ چچی کو بے چارے پر ترس آ گیا۔ انہوں نے قریب جا کر اس کی پشت پر جو شفقت سے ہاتھ رکھا تو اس کی تر بتر قمیص نچوڑنے والی ہو رہی تھی۔ اور چونک کر بولیں:

''ارے! یہ تمہیں اس قدر پسینہ آ رہا ہے، کیسے پانی پانی ہو رہے ہو۔'' حامد سسک کر بولا: ''شرم سے......''

''واہ! اب اتنی شرم آ رہی ہے کہ پانی پانی ہو رہے ہیں صاحب زادے۔'' حامد کے چچا اس کی بات پر ہنس دیئے۔ بچو! جب کوئی اپنی کسی نازیبا حرکت پر بہت شرمندگی محسوس کرے تو ایسے موقع پر یہ محاورہ بولتے ہیں کہ فلاں تو شرم سے پانی پانی ہو رہا ہے۔☆☆☆

پاکستان کہانی

''اٹاری گزر گیا اور گاڑی واہگہ پہنچ گئی۔ یہاں پہلی بار ایک درخت کے ساتھ لہراتا ہوا پاکستانی سبز پرچم دیکھ کر چہرے کھل گئے۔ مسلمانوں نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ منزل پر پہنچ کر راستے کی ساری مصیبتیں، تکلیفیں اور اذیتیں بھول گئیں۔ ریل اب پاکستان کی آزاد اور خوب صورت فضاؤں میں سفر کر رہی تھی، دور مغل پورہ ورکشاپ کی چمنی نظر آئی۔ مغل پورہ پر ٹرین رکی تو مسلمان روٹیاں، پانی اور اچار لے کر ٹرین کی طرف دوڑے اور زخمیوں کو اتار کر مرہم پٹی کی گئی۔'' (اے حمید)

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تو احسان احمد نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر قریبی چارپائی پر بیٹھے چھٹیوں کا کام کرتے اپنے چودہ سالہ بیٹے اظفر کی طرف دیکھ کر بولے۔

''اظفر بیٹا! باہر جا کر دیکھنا۔ کون آیا ہے۔''

''جی اچھا ابو۔'' اظفر نے پین کاپی میں رکھتے ہوئے کہا پھر چارپائی سے اتر کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا جب کہ احسان احمد دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد اظفر واپس آ گیا۔

''ابو! میرا دوست جمیل آیا ہے۔'' اظفر نے احسان احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' احسان احمد نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا تو اظفر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر جمیل کو کرسی پر بٹھایا اور پھر وہ بیٹھک سے نکل کر کچن میں آ گیا جہاں اس کی امی اور بڑی بہن صدف دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

''باجی! میرا دوست جمیل آیا ہے۔ آپ مشروب تو بنا دیں۔'' اظفر نے اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اچھا بنا دیتی ہوں۔'' صدف نے جواب دیتے ہوئے کہا تو اظفر شکریہ ادا کر کے بیٹھک میں آ گیا۔

جمیل اس کا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ دونوں ہم عمر تھے۔ جمیل کا تعلق ایک متمول گھرانے سے تھا جب کہ اظفر متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ امیری اور غریبی کے باوجود ان دونوں کی دوستی میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''کیسے ہو جمیل۔ آج راستہ بھول کر ادھر کیسے آ گئے؟'' اظفر نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔ تم اپنا بتاؤ۔''

''بس یار! تم تو جانتے ہو کہ میرے ماموں حدید کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور علاج معالجے کے لئے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتے رہے کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔'' اظفر نے کہا۔

جمیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارے ماموں کی حالت کیسی ہے؟''

''علاج ہو رہا ہے۔'' اظفر نے بتایا۔ ''ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ ان کا پاؤں ٹھیک ہونے میں کم سے کم پانچ سے چھ ماہ لگ سکتے ہیں

اور دوائیاں بھی بہت مہنگی ہیں۔ روزانہ پانچ سو روپے کی دوائی استعمال ہو رہی ہے۔''

''ہونہہ۔'' جمیل نے سر ہلایا پھر اس نے اپنے لباس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکال کر اظفر کی طرف بڑھا دیا تو اظفر نے حیران کن نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس میں کیا ہے؟''

''پیسے ہیں۔''

''پیسے؟'' اظفر حیران ہوا۔

''میرے ابو نے تمہارے ماموں کے علاج معالجے کے لئے کچھ پیسے بھیجے ہیں۔'' جمیل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔''میں نے ہی ابو کو تمہارے ماموں کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتایا تھا تو انہیں تمہارے ماموں کے ایکسیڈنٹ کا افسوس ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر علاج معالجے میں کسی قسم کی پریشانی ہو تو تم لوگ انہیں یاد کر لینا۔''

اظفر نے جمیل سے لفافہ لے کر اپنے لباس کی جیب میں رکھ لیا۔

جمیل جب رخصت ہو گیا تو اظفر نے گلاس اور ٹرے کچن میں رکھے اور اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ابو بدستور اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔

''برخوردار! جمیل کیسے آیا تھا؟'' ابو نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے ہی مجھ سے ملنے آیا تھا۔'' اظفر نے جواب دیتے ہوئے کہا تو اس کے ابو''ہونہہ'' کہہ کر دوبارہ اخبار میں مشغول ہو گئے۔

اظفر کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ابو کو یہ نہیں بتایا تھا کہ جمیل اس کے ماموں حدید کے علاج معالجے کے لئے پیسے دے گیا ہے۔ اس نے یہ پیسے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کچھ روز پہلے اظفر کے ماموں حدید کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر سوار تھے اور تیز رفتاری سے اوور ٹیکنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامنے سے بھی ایک کار انتہائی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ خود کو بچانے کی کوشش میں حدید نے موٹر سائیکل سڑک کے ساتھ بنے کچے راستے پر ڈالی تھی کہ موٹر سائیکل سلپ ہو گئی اور حدید اچھل کر ایک گڑھے میں گر گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لایا گیا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی لیکن اللہ نے کرم کیا اور اس کی جان بچ گئی۔ اب ایک ہفتے سے اس کا علاج ہو رہا تھا۔

چھٹیوں کا کام کرنے کے بعد اظفر نے اپنی کتابیں بیگ میں رکھیں اور بیگ اٹھائے وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بیگ اس کی مخصوص جگہ پر رکھا اور پھر لباس کی جیب سے جمیل کا دیا ہوا لفافہ نکالا اور اس میں سے پیسے نکال کر گننے لگا۔ وہ ہزار، ہزار کے نئے نوٹ تھے۔ ٹوٹل وہ دس ہزار تھے۔

''میں ان پیسوں سے خوب انجوائے کروں گا۔'' اظفر نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے کہا اور پھر اس نے پیسے واپس لفافے میں ڈال کر لفافہ الماری میں کتابوں کے بیچ چھپا کر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

چار روز کے بعد احسان احمد عصر کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو وہاں جمیل کے ابو حسام بیگ بھی نماز پڑھنے آئے ہوئے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد دونوں اکٹھے ہی مسجد سے نکلے اور باتیں کرتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ باتوں باتوں کے دوران ہی حسام بیگ نے پوچھا۔

''حدید کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اس کا علاج معالجہ کیسا ہو رہا ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔ اب اس کی طبیعت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔'' احسان صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کچھ روز پہلے میں نے اپنے بیٹے جمیل کے ہاتھ پیسے بھجوائے تھے کیا آپ نے وہ پیسے حدید کو دے دیئے تھے۔'' حسام بیگ نے پوچھا تو احسان احمد بے اختیار ٹھٹک گئے۔ دوسرے ہی لمحے انہیں یاد آ گیا کہ کچھ روز پہلے ان کے بیٹے اظفر سے جمیل ملنے آیا تھا۔ وہ جمیل کو حدید کے لئے پیسے دے گیا تھا مگر جمیل نے ان پیسوں کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو ان کے بیٹے اظفر کا کردار مشکوک ہو جائے گا اور اس کی عزت جاتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے کہا۔

''جی جی۔ مل گئے تھے۔ آپ کا بہت شکریہ۔''

انہوں نے سوچا اگر انہوں نے اظفر کی سرزنش نہ کی تو اس کی

عادت بگڑ جائے گی اور وہ امانت میں خیانت کرتا رہے گا۔

وہ جب گھر پہنچے تو اظفر کہیں جانے کے لئے گھر سے نکل رہا تھا مگر اپنے ابو کو غصے کی حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

''برخوردار! میرے کمرے میں آؤ'' احسان احمد نے تحکم آمیز لہجے میں کہا اور پھر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب کہ اظفر بھی دھیمی رفتار سے چلتا ہوا ان کے پیچھے بڑھ گیا۔ وہ کمرے میں پہنچا تو اس کے ابو ہاتھ میں کتاب لیے راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ وہ ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دروازہ بند کرو''

اظفر دروازہ بند کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو''

اظفر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''برخوردار۔ کیا جمیل نے حدید کے لئے آپ کو پیسے دیئے تھے؟''

ابو کی بات سن کر وہ ٹھٹک گیا اور اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ شاید انہیں جمیل نے بتایا ہوگا۔

''جی ابو''

''کتنے پیسے تھے؟''

''دس ہزار''

''آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''جج۔ جج۔ جی۔ وہ۔ وہ'' اظفر کے پاس جواب نہیں تھا۔

''سارے پیسے پڑے ہیں یا کچھ خرچ کر دیئے ہیں؟''

''دو سو خرچ ہو گئے ہیں''

احسان احمد چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''آج جمیل کے ابو مسجد میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے جمیل کے ہاتھ کچھ روز پہلے دس ہزار بھیجے تھے۔ آپ سچ سچ بتائیں آپ نے ان پیسوں کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟''

اظفر خاموش رہا۔ اس کے پاس جواب دینے کے لئے الفاظ ہی نہیں تھے۔ شرمندگی سے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''جواب دو برخوردار''

''ابو۔ دراصل وہ......''

''آپ کی نیت خراب ہو گئی تھی۔'' احسان احمد نے بیٹے کی بات کاٹی۔ ''دیکھو بیٹا۔ میری بات غور سے سنو۔ قرآن پاک کی سورت النساء میں ہے کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ امانت دار خزانچی کے لئے بھی صدقہ کرنے والے کے برابر ہی ثواب ہے جب وہ امیر کے حکم کے مطابق خوش دلی سے پورا پورا مال اس شخص کے حوالے کر دیتا ہے جس کے لئے حکم ہوا ہے۔ قرآن و حدیث کی رو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی کی کوئی چیز امانت رکھوائی جائے یا کسی کے لئے پیسے دیئے جائیں تو آپ انہیں پہنچا دو نہ کہ خیانت کرو۔ امانت میں خیانت کرنے والا دنیا میں تو رسوا ہوگا ہی لیکن روز قیامت میں اسے سخت سزا ملے گی۔'' اتنا کہہ کر احسان احمد خاموش ہو گئے۔ ان کی نظریں اظفر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ابو۔ میں آئندہ خیانت نہیں کروں گا۔'' اظفر نے ابو کی بات سمجھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تو احسان احمد کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھر آئے۔ ان کا بیٹا ان کی بات سمجھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''بہت خوب برخوردار۔ اللہ تمہیں استقامت عطا فرمائے۔ آپ باقی پیسے لے آئیں میں دو سو روپے ملا کر دس ہزار روپے حدید کو اس کی امانت دے دوں گا'' احسان احمد نے کہا تو اظفر نے اپنے کمرے کی الماری سے نو ہزار آٹھ سو روپے لا کر ابو کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ احسان احمد نے اپنی جیب سے دو سو روپے نکال کر ان پیسوں میں رکھے اور پھر وہ اظفر سے بولے۔

''آؤ۔ یہ امانت حدید کو دے آئیں''

پھر دونوں باپ بیٹا گھر سے نکل کر حدید کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ اظفر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جب تک اس کے پاس پیسے موجود تھے اس کے ضمیر پر ایک بوجھ سا تھا اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابو کی بات سمجھ کر اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر عاصم ایک ذہین اور محنتی افسر ہیں۔ ان کی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بہت عزت اور قدر کی جاتی ہے۔ مجرموں اور ان سے اعتراف جرم کروانا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔

ایک دن انہیں خبر ملی کہ قریبی ہوٹل میں چوری ہوگئی ہے۔ ہوا یوں کہ سیٹھ گلزار اس ہوٹل کے کمرے میں قیام پذیر تھے۔ مال دار بھی بہت تھے اور اپنی قیمتی ساز وسامان کے ساتھ ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ ایک دن وہ ہوٹل سے کسی کام سے نکلے۔ واپس آئے تو کمرے سے قیمتی سامان غائب تھا۔ ہوٹل مینیجر نے فوراً انسپکٹر عاصم کو فون کر کے بلایا۔ انسپکٹر نے سب سے پہلے ویٹروں سے تفتیش کا آغاز کیا۔ ایک ویٹر سے سوال و جواب کچھ یوں تھے۔ ''جناب! جب میں سیٹھ صاحب کے کمرے میں آیا تو میں نے چور کو کمرے کے روشن دان سے کودتے دیکھا۔'' انسپکٹر عاصم نے کمرے کا بہ غور جائزہ لیا تو انہوں نے فوراً ویٹر پر ہی شک کیا۔ بتایئے بچو؟ ویٹر کیسے پکڑا گیا؟؟؟ تو پھر آپ بھی تھوڑی سی ذہانت کا استعمال کیجئے اور چور کا پتا لگایئے اور ہمیں جواب لکھ بھیجئے۔

پیارے بچو! جولائی کے کھوج لگایئے کا جواب 888+88+8+8+8=1000

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- عائشہ فاطمہ قادری، کاموکی
2- عمر عدنان، اسلام آباد
3- مریم بنت علی، کراچی
4- حفصہ شفیق، کالا باغ، میانوالی
5- مقدس چوہدری، راول پنڈی

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان میں کئی شخصیات ایسی بھی ہیں، جنہوں نے پوری دنیا میں شہرت حاصل کی اور پاکستان کا نام روشن کیا۔ چند شخصیات کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے:

ڈاکٹر عبدالقدیر خان: پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ ایٹمی سائنس دان ہیں۔ وہ 1936ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ 1952ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمن اور ہالینڈ گئے۔ ایمسٹرڈیم کی ایک فرم میں ملازمت کی، مگر پاکستان کی محبت میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گئے۔ ملک کو ایٹمی طاقت بنانے کے کام میں جتے رہے۔ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی شبانہ روز محنت کے بعد بالآخر پاکستان دنیا کا ساتواں اور اسلامی ملک کا پہلا ایٹمی ملک بن گیا۔ پوری قوم انہیں فخر سے ''محسنِ پاکستان'' کے نام سے یاد کرتی ہے جس کے وہ بلاشبہ حق دار ہیں۔ کہوٹہ میں ایک ریسرچ لیبارٹری ان کے نام سے موسوم ہے۔

جہانگیر خان: انہیں بلاشبہ اسکوائش کے بے تاج بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ 1963ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد روشن خان بھی اپنے دور کے بڑے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ بچپن میں ایک آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے جہانگیر خان کو بھاگنے دوڑنے سے سختی سے منع کیا تھا، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ خاموشی سے اسکوائش کھیلتے رہے۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1982ء سے 1991ء تک مسلسل دس مرتبہ برٹش اوپن جیتا جو آج تک عالمی ریکارڈ ہے اور گینز بک آف ورلڈ کا حصہ ہے۔ مشہور عالم ''ٹائم'' میگزین نے انہیں ایشیاء کا ہیرو قرار دیا ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی: پاکستان کے نامور مصور عبدالرحمٰن چغتائی 1897ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ مصوری کی تعلیم حاصل کر کے اس فن میں کمال حاصل کیا۔ ایک ہزار سے زائد تصاویر بنائیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر نیویارک میں اقوام متحدہ کے دفاتر میں آویزاں ہیں۔ انہیں 1934ء میں برطانوی حکومت نے خان بہادر اور بعد میں 1960ء میں حکومت پاکستان نے ہلالِ امتیاز دیا۔ انہوں نے علامہ اقبال کے کلام کو بے حد خوب صورت انداز میں مصور کیا۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے مونوگرام انہوں نے ہی ڈیزائن کیے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان کے ابتدائی چار ڈاک ٹکٹوں میں سے ایک ان کا ڈیزائن کیا ہوا ہے۔

نذیر صابر: 17 مئی 2000ء کی صبح پاکستان کے معروف کوہ پیما نذیر

صابر نے نیپال میں واقع دنیا کی سب سے بلند پہاڑی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا اور وہاں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرایا۔ وہ وہاں جانے والے اور پاکستان کا پرچم لہرانے والے پہلے پاکستانی تھے۔ انہوں نے وہاں پاکستان کا قومی ترانہ بھی گایا۔ وہ ترتیب کے اعتبار سے دنیا کے 899 ویں کوہ پیا تھے جنہوں نے یہ چوٹی سر کی۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ دیا۔ نذیر صابر کے علاوہ تین اور کوہ پیا بھی، جن کا تعلق پاکستان سے ہے، یہ چوٹی سر کر چکے ہیں۔ ان میں حسن صد پارہ، ثمینہ بیگ اور عبدالجبار بھٹی شامل ہیں۔

نصرت فتح علی خان: نصرت فتح علی خان پاکستان کے نامور گلوکار اور موسیقار تھے۔ پہلے ان کا نام پرویز تھا، بعد میں ایک بزرگ کے کہنے پر ان کا نام بدل کر نصرت رکھ دیا گیا۔ انہوں نے اپنی موسیقی اور گائیکی سے قوالی کا نیا انداز متعارف کرایا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں مقبول تھے۔ انہوں نے کئی مشہور قوالیاں، نغمے اور قومی نغمے گائے ہیں۔ انہوں نے مظفر وارثی کی حمد ''کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے'' کو نئے انداز سے پڑھا۔ انہوں نے اپنی آواز میں 125 والیم ریکارڈ کرائے۔ اس بناء پر وہ 2001ء کے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا حصہ بنے۔ 16 اگست 1997ء کو ان کا انتقال ہوا۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سمیت کئی تمغے ملے۔ ان پر یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا گیا ہے۔

نمیرہ سلیم: 6 اگست 2006ء کو امریکی خلائی ادارے ناسا (NASA) نے پاکستانی خاتون نمیرہ سلیم کو خلائی سفر کے لیے منتخب کیا۔ وہ عالم اسلام کی پہلی خاتون ہیں جو اس سفر کے لیے منتخب ہوئیں۔

یہاں یہ بات بھی پاکستان کے لیے خوش کن ہے کہ نمیرہ سلیم نے 2007ء میں قطب شمالی اور 2008ء میں قطب جنوبی پر پاکستان کا پرچم لہرایا تھا۔ وہ قطبین پر پاکستانی پرچم لہرانے والی پہلی خاتون ہیں۔ نمیرہ فرانس میں مقیم ہیں۔

ایم ایم عالم: 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں پاکستان کی بری، بحری اور فضائی فوج نے عوام کے ساتھ مل کر بھرپور مقابلہ کیا اور دشمن کا خواب چکنا چور کر دیا۔

اسی جنگ میں پاک فضائیہ کے ایک سپوت ایم ایم عالم (محمد محمود عالم) نے 7 ستمبر 1965ء کو بھارت کے دس ہنٹر طیاروں میں سے پانچ کو محض تیس سیکنڈ میں تباہ کر کے عالمی ریکارڈ بنایا۔ وہ ایک روز قبل بھی 6 ستمبر 1965ء کو دو طیارے مار گرانے پر ستارۂ جرأت حاصل کر چکے تھے۔ 7 ستمبر کو اس عالمی ریکارڈ پر ایک بار پھر انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا۔ اس طرح وہ پاک فوج کے واحد سپوت ہیں جنہیں ایک ہی تمغہ دو مرتبہ اور ایک دن کے وقفے سے ملا۔

ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی: وہ بھارت میں 1939ء میں پیدا ہوئے۔ 17 برس کی عمر میں کراچی آئے اور طب کی تعلیم مکمل کی۔ بعد میں سرجری میں فیلوشپ کے لیے برطانیہ چلے گئے اور تقریباً دس سال تک مختلف اسپتالوں میں خدمات انجام دیں۔ وہ وہاں کی نیشنل ہیلتھ سروس سے بے حد متاثر ہوئے پھر پاکستان آ کر مخالفتوں کے باوجود اسے متعارف کرانے میں مصروف ہو گئے۔

1974ء میں سول اسپتال کراچی میں 8 بستروں پر مشتمل ایک وارڈ قائم کیا جو آج دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے جس میں دو سو بستر ہیں اور اسے ہم ''سندھ انسٹی ٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلانٹیشن'' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کا مختصر نام "siut" ہے۔ یہ عطیہ اعضاء اور اعضاء کی پیوند کاری کا بڑا مرکز ہے۔

ارفع کریم: انہیں نو سال کی عمر میں سب سے کم عمر مائیکرو سافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل (ایم سی پی) ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ارفع کریم 1996ء میں فیصل آباد میں پیدا ہوئیں۔ 2005ء میں جب ان کی عمر فقط دس سال بھی مکمل نہیں تھی، انہیں حکومت پاکستان نے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی دیا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی پاکستان کی سب سے کم عمر طالبہ تھیں۔ افسوس نہایت کم عمری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی: ان کی وجہ شہرت کیمیا دان کی رہی ہے مگر وہ اچھے مصور، شاعر، ادیب اور فلسفی بھی تھے۔ وہ 1897ء میں پیدا ہوئے۔ حکیم محمد اجمل خان کی خواہش پر 1922ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے۔ انہوں نے چاند بوٹی کے عرق سے ہائی بلڈ پریشر، ہسٹریا اور دیوانگی کے مرض کے لیے دوا بنائی جسے حکیم اجمل خان کے نام موسوم کرتے ہوئے ''اجملین'' کا نام دیا۔ پاکستان آ کر حکومت پاکستان کی خواہش پر ''پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ'' کی بنیاد ڈالی۔ 1994ء میں 97 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن: بین الاقوامی سائنس دان ستمبر 1947ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سر عبدالرحمٰن، دہلی یونی ورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے 1964ء میں کراچی یونی ورسٹی سے نامیاتی کیمیا میں ایم ایس سی کیا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج چلے گئے۔ وہ کراچی یونیورسٹی کے ادارے HEJ سے منسلک ہیں۔ 60 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ 57 اسلامی ملکوں کی سائنسی ترقی و ترویج کے ادارے "Comstech" کے نگران رہے۔ جس کے تحت ایک ڈیجیٹل لائبریری اسلام آباد میں قائم ہے۔ وہ وفاقی وزیر برائے سائنس ٹیکنالوجی بھی رہے۔ یونیسکو کا سائنس پرائز انہیں ملا جو ایک طویل عرصے بعد کسی مسلمان سائنس دان کے حصے میں آیا۔ انہیں یہ انعام سدا بہار پودے پر کینسر کے خاتمے کے لیے کیمیائی مرکبات کی تلاش پر دیا گیا تھا۔

فیض احمد فیض: اردو کے توانا لہجے کے شاعر فیض احمد فیض اپنی شاعری کی وجہ سے دنیا کے ہر خطے میں پاکستان کا حوالہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ 13 فروری 1911ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے مجموعے کے نام ہیں: نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ اور سر وادیٔ سینا، نسخہ ہائے وفا کلیات کا مجموعہ ہے۔ ان کا انتقال 20 نومبر 1984ء کو ہوا۔

محمد ولی رازی: سیرۃ النبی ﷺ پر لکھی گئی کتاب ''ہادیٔ عالم'' کے مصنف ہیں۔ اس کتاب پر حکومت پاکستان نے 1983ء میں انہیں صدارتی تمغہ دیا اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہ سیرتِ طیبہؐ پر لکھی گئی اردو کی پہلی کتاب ہے جس میں کوئی نقطہ استعمال نہیں ہوا۔ ان کا یہ کام ستائش کے قابل ہے۔

عبدالستار ایدھی: ہندوستان کی ریاست کاٹھیاواڑ کے گاؤں ''بانٹوا'' میں 1928ء میں پیدا ہونے والے اس عظیم انسان نے اپنی ساری زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ وہ غریبوں اور بے آسرا مرد و خواتین اور بچوں کے حقیقی محسن تھے۔ ایدھی سینٹر کے ملک بھر میں بنے ہوئے گھر بے آسرا کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا ایمبولینس بیڑا دنیا کا سب سے بڑا بیڑا ہے۔ وہ بلاشبہ پاکستان کا مضبوط حوالہ ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف دنیا کے ہر بڑے ملک نے کیا اور انہیں اپنے اعزاز سے نوازا۔

حکیم محمد سعید: 9 جنوری 1920ء کو دہلی میں پیدا ہونے والے حکیم محمد سعید نے فقط 9 سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ان کا دہلی میں ہمدرد دواخانہ تھا۔

وہ 1948ء میں اپنی اہلیہ اور صاحب زادی کے ہمراہ ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے اور محنت کر کے پاکستان کی ہمدرد کی بنیاد ڈالی، جو آج طب اسلامی کے حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔

وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ سندھ کے سابق گورنر بنے۔ انہوں نے مدینۃ الحکمۃ بنایا جو علم و حکمت کا شہر ہے۔ یہاں دنیا کی سب سے بڑی لائبریری اور ہمدرد یونیورسٹی کے علاوہ کئی ادارے ہیں۔ انہوں نے محنت سے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھایا۔

مستنصر حسین تارڑ: لاہور میں 1939ء میں پیدا ہونے والے اس عظیم پاکستان کے لیے یہ جملہ کہا جا سکتا ہے: ''وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ وہ ٹی وی اداکار ہے، کمپیئرنگ کی۔ صبح کی نشریات کا آغاز ان ہی سے ہوا اور چاچا جی کے نام سے مشہور رہے۔ ڈرامے اور کالم لکھے، سفر کیے اور بعد میں سفرنامے لکھے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ پاکستان کے کئی پہاڑ اور چوٹیاں ان کے سفرناموں کی بدولت دنیا میں متعارف ہوئے۔ روس میں ان کے سفرنامے کا حصہ آج بھی یونیورسٹی نصاب کا حصہ ہے۔ کئی سفرناموں کے علاوہ حج اور عمرے کے سفرنامے بھی انہوں نے لکھے۔

عمران خان: عمران خان سیاست دان ہیں اور پاکستان میں کینسر کے اسپتال کے بانی بھی، مگر ان کا ایک اور مضبوط حوالہ کرکٹ ہے۔ وہ کئی برسوں تک پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا حصہ رہے۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1992ء میں پاکستان نے جب ورلڈ کپ جیتا تو وہ اس ٹیم کے کپتان تھے۔

گل جی: پاکستان کے ممتاز مصور گل جی 1926ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ انجینئر اور ایم ایس سی تھے۔ انہوں نے اس کے برعکس مصوری کو بہ طور پیشہ اپنایا۔

انہوں نے فرانس، امریکہ، افغانستان، سعودی عرب اور ایران سمیت کئی ملکوں کے سربراہوں کے پورٹریٹ بنا کر انہیں پیش کیا۔ شاہ فیصل مسجد کی شان دار تزئین اور میناروں پر ان کا کام دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

بُڑھیا کی بَددُعا

کاشف ضیائی

لاہور سے کوئی اٹھائیس، تیس میل باہر کی طرف سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد ہے جس کا نام "جمالیہ" ہے۔ یہاں ایک پرانی مسجد ہے جس میں کسی زمانے میں ایک حافظ صاحب بچوں کو قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ نام تو ان کا حافظ نذیر حسین تھا لیکن سب لوگ انہیں ادب سے حافظ جی، حافظ جی کہتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حافظ جی انتہائی نیک بزرگ تھے۔ کسی سے مانگتے کچھ نہ تھے اور سارا دن بچوں کو پڑھاتے رہتے تھے۔ ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ دم درود میں بھی مشہور تھے۔ علاقے بھر سے لوگ ان کے پاس دم کروانے آتے اور شفا پا کر جاتے۔

ایک دن عصر کے بعد حافظ جی روزانہ کی طرح بچوں کو قرآن پڑھانے میں مشغول تھے کہ مسجد کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے ایک شخص اترا۔ اس کی آنکھوں پہ سیاہ چشمہ تھا، حلیے سے وہ بڑا امیر آدمی دکھائی دیتا تھا اس نے خوش بو ایسی لگا رکھی تھی کہ ساری فضا معطر ہو گئی۔

وہ کار سے نکل کر سیدھا حافظ جی کے پاس آیا۔ جتنی دیر وہ جوتے وغیرہ اتارتا رہا بچے خاموش اور حیران ہو کر اسے دیکھتے رہے۔ دراصل اس کا رعب ہی ایسا تھا کہ ہر شخص متاثر ہو جاتا۔ حافظ جی بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے، قریب آ کر اس نے بلند آواز سے سلام کیا اور ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ان کے پاس بیٹھنا چاہتا ہو۔ حافظ جی اس کی مراد سمجھ گئے اور انہوں نے سلام کا جواب دے کر اس کے لیے ایک طرف جگہ بنا دی۔ وہ شخص سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر یوں ہی گزری پھر اس شخص نے سر اٹھایا اور نظریں ملائے بغیر بولا۔ "حافظ نذیر حسین آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں! میرا ہی نام نذیر حسین ہے۔" حافظ جی نے جواب دیا۔ "فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وہ جی...... وہ...... وہ...... میرا ایک مسئلہ ہے۔" وہ شخص یہاں تک کہہ کر رک گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی اندرونی طاقت نے اس کی زبان روک لی ہے۔

حافظ جی کو طویل عرصہ ہو گیا تھا یہ کام کرتے ہوئے۔ اتنا وہ جان گئے کہ یہ کوئی دولت مند شخص ہے اور کسی پریشانی کی وجہ سے پریشان بھی ہے۔ ایسے لوگوں کو وہ خوب سمجھتے تھے، انہوں نے اسے ہمت دلائی۔

"گھبرایئے مت محترم!" قدرت نے جہاں مسائل رکھے ہیں وہاں ان کا حل بھی رکھا ہے، آپ کھل کر بات کیجئے۔"

"وہ جی...... وہ......" وہ شخص پھر ہکلانے لگا، آخر ہمت کر کے

بولا۔ میرے یہاں بائیں ہاتھ کی پشت پر بڑی جلن رہتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے دایاں ہاتھ حافظ جی کے سامنے الٹ دیا، انہوں نے دیکھا کہ ہاتھ کی پشت پر اس طرف بڑا سا ایک داغ ہے جس کا رنگ سیاہ ہے اور اس کے اردگرد کی جلد سرخ ہے۔ داغ ایسا تھا کہ زیادہ دیر دیکھا نہ جاتا تھا۔

''ہزار طرح کے علاج کروا چکا ہوں۔'' وہ شخص پھر کہنے لگا۔ ''تین تین لاکھ روپے کے کورس کروائے ہیں ایک وقت میں لیکن اس جلن کو آرام نہیں آتا۔ ہر وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آگ سی لگی ہوئی ہے۔ لاہور کا کوئی بھی بڑا ڈاکٹر میں نے نہیں چھوڑا ہے لیکن شفا نہیں ہوتی۔ بس لمبے علاج سے ذرا سا فرق پڑ جاتا ہے پھر وہی حالت ہو جاتی ہے...... آپ کے پاس بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ اس شخص کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور دانت بھینچے ہوئے تھے۔

''یہ کون سی پریشانی والی بات ہے۔'' حافظ جی نے اسے اطمینان دلایا میں ابھی دم کیے دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بڑی شفا رکھی ہے۔'' یہ کہہ کر حافظ جی نے سورتیں پڑھیں اور نشان کی جگہ دم کر دیا۔ دم ہوتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان پھیل گیا۔ اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا لیکن جانے سے پہلے ہزار ہزار کے نوٹ نکالے اور مٹھی کی طرح حافظ صاحب کو دینا چاہے، حافظ جی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور کہا کہ میں اللہ کی رضا کے لیے یہ کام کرتا ہوں، لوگوں کی خدمت کے پیسے نہیں لیتا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد وہ شخص پھر آ موجود ہوا۔

اس نے بتایا کہ دم سے دو تین دن بڑا آرام رہا لیکن کل رات سے پھر تکلیف شروع ہوگئی اور اب اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہاتھ جل رہا ہو۔ حافظ جی چوں کہ کام ہی یہی کرتے تھے انہوں نے چپ چاپ پھر دم کر دیا۔ وہ شخص پھر شکریہ ادا کر کے چلا گیا لیکن اس بار اس نے پیسے نہ دیئے کیوں کہ حافظ جی کی طبیعت سے وہ واقف ہو چکا تھا۔

تیسرے دن وہ پھر آ گیا۔ اس مرتبہ بھی وہی مسئلہ تھا یعنی دو تین دن آرام رہا پھر جلن شروع ہوگئی۔ اس دفعہ حافظ جی ذرا چونکے کیوں کہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے اس سے پوچھا محترم! آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ شخص بھی یہ سن کر چونک گیا کیوں کہ اس سے پہلے حافظ جی نے اس کا نام نہ پوچھا تھا۔

میرا نام گلزار احمد ہے...... سیٹھ گلزار احمد۔'' اس نے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر جواب دیا۔

''اور آپ کرتے کیا ہیں؟'' حافظ جی نے دوسرا سوال کیا۔

''میں کچھ نہیں کرتا۔ سب کچھ میرے ملازم کرتے ہیں۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''میری ایک شوگر مل ہے بلکہ اس علاقے کی سب سے بڑی شوگر مل میری ہے، سارا کام مینیجر کے حوالے کیا ہوا ہے، وہی سنبھالتا ہے سب کچھ۔''

''یہ تو حیرت کی بات ہے کہ دم سے دو تین دن کے لیے آرام آ جاتا ہے پھر وہی حالت ہو جاتی ہے...... ہے ناں۔''

''بالکل ہے۔'' اس نے توجہ سے کہا۔ ''اسی لیے تو میں آپ کے پاس دوبارہ آیا ہوں، ذرا پکا دم کیجیے دوبارہ جلن نہ ہو۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ......'' حافظ جی کہتے کہتے رک گئے۔

اس شخص کی نظریں حافظ جی کے چہرے پہ تھیں۔ ''بولیے بولیے حافظ جی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ رک کیوں گئے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ حافظ جی نے کہا۔ ''یہ کسی گناہ کی سزا ہو۔''

''کیا مطلب آپ کا؟''

حافظ جی فوراً بولے۔ ''میرا مطلب ہے کہ بعض اوقات انسان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے جس کی سزا کے طور پر قدرت اس پہ کوئی بیماری ڈال دیتی ہے پھر جب تک وہ توبہ نہ کرے ٹھیک نہیں ہوتا۔''

''دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟'' وہ گھور کر بولا۔

''کون سا گناہ ہوا ہے مجھ سے؟''

''میں آپ کو غلط قرار نہیں دے رہا'' حافظ جی کا لہجہ بدستور نارمل تھا۔

''میں تو صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ بعض اوقات ان جانے میں انسان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے جس کی......''

''روکیے اپنی زبان کو۔'' حافظ جی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ شخص پھنکار کر بولا۔ ''میں اتنا معمولی آدمی نہیں ہوں کہ آپ جو چاہے کہہ دیں مجھے اور وہ بھی میرے ہی منہ پر۔''

حافظ جی سمجھ گئے کہ سب طاقت کا نشہ بول رہا ہے۔ انہوں نے اپنے لہجے کو اسی طرح ٹھنڈا رکھا اور مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔ ''سیٹھ صاحب! آپ تو ناراض ہونے لگے، میرا مقصد آپ کو

غلط کرنا نہیں۔ یہ چیز تو میرے ساتھ بھی ہے۔ تمام انسانوں کی طبیعت ایسی ہے کہ انہیں اپنی نیکیاں یاد رہتی ہیں اور گناہ بھول جاتے ہیں۔ میں یوں کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر یہ کسی گناہ کی سزا ہے تو پھر میرے دم سے ٹھیک نہ ہوگی۔ اس کے لیے تو توبہ ہی کرنے پڑے گی۔"

"آپ ہی بتا دیں کیا گناہ کیا ہے میں نے۔" سیٹھ کے لہجے میں طنز تھا۔

"میں آپ کی ماضی کی زندگی سے واقف نہیں۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔ "میں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو ٹھیک مشورہ دے رہا ہوں۔"

سیٹھ گلزار اتنی دیر تک کھڑا ہو چکا تھا، اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے ان کی باتیں ناگوار گزری ہیں۔ وہ تھوڑی دیر نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا رہا پھر پیر پٹخ کر چلا گیا۔

اس تمام عرصے میں حافظ جی اطمینان سے بیٹھے رہے۔ انہیں اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ وہ اسے صحیح طرح سمجھا نہ سکے لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ یہ بہرحال انہیں امید تھی کہ سیٹھ گلزار دو تین دن بعد جلن سے بے تاب ہو کر پھر آئے گا۔ دو تین دن گزر گئے لیکن حافظ جی کی امید پوری نہ ہوئی۔ سیٹھ گلزار ان کے پاس دوبارہ نہ آیا۔ ہوتے ہوتے اس بات کو تین ماہ گزر گئے اب کوئی امید بھی نہ رہی۔

اس کے باوجود ان کا دل کہتا تھا کہ سیٹھ سے دوبارہ ملاقات ضرور ہوگی اور ایک دن ایسا ہو بھی گیا۔ مسجد کے سامنے لمبی کار آ کر رکی اور اس میں سے سیٹھ گلزار اترا۔ اس کے چہرے پہ خوشی کا احساس نمایاں تھا اس نے آتے ہی مسرت سے سلام کیا اور بغیر کچھ کہے سنے اپنا ہاتھ پلٹ کر آگے کر دیا۔

حافظ جی نے دیکھا کہ ہاتھ بالکل صاف تھا، زخم کیا زخم کا نام و نشان بھی وہاں نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ کو شفا مل چکی تھی اور لگتا تھا اسی بات کی اسے خوشی تھی لیکن کیسے؟ یہ ابھی پتا نہ تھا۔ چناں چہ حافظ جی نے شوق بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ سیٹھ گلزار نے بھی ان کی بے چینی بھانپ لی اور کہنے لگا۔

"ضرور ضرور حافظ صاحب! میں آپ کو ضرور بتاؤں گا کہ مجھے شفا کیسے ملی لیکن اس سے پہلے اپنے بچوں میں یہ مٹھائی تو تقسیم کر دیجیے جو میرے ملازم لائے ہیں تاکہ یہ بھی ہماری خوشی میں شریک ہو جائیں۔ چناں چہ بچوں میں مٹھائی تقسیم کر دی گئی پھر سیٹھ صاحب نے حافظ جی کے پاس بیٹھ کر یوں اپنی بات سنائی۔

"حافظ صاحب! جب میں آپ کے پاس سے اٹھ کر گیا تو سخت غصے میں تھا، میرے ذہن نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ بار بار یہ بات گھوم کر میرے دماغ میں آتی بھی تھی۔ اتفاق سے اس رات تکلیف کی وجہ سے ساری رات نیند نہ آئی۔ میرا ذہن بار بار آپ کی بات کی طرف گیا۔ آخر رات کے پچھلے پہر میں میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے دس برس پہلے جب میں نے اپنی فیکٹری کے لیے جگہ خریدی تو اس وقت ایک خاص واقعہ ہوا تھا جس کے بعد سے مجھے یہ تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ جب میں نے فیکٹری کے لیے ایک لمبی چوڑی زمین خریدی اور اس پر تعمیر کا آغاز کرنا چاہا تو بہت خوش تھا کیوں کہ یہ جگہ ایک شوگر مل کے لیے ہر لحاظ سے مناسب تھی۔ بس ایک مسئلہ تھا میری زمین کے آخر میں ایک بڑھیا کی تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ رہتی بھی وہیں تھی اور اس نے وہاں ایک تندور بنا رکھا تھا جس کی روٹیاں بیچ کر گزارا کرتی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ زمین مجھے بیچ دو۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اسے ڈبل رقم کی پیش کش کی اس نے اس پر بھی انکار کر دیا اور پکا ارادہ کیا کہ یہ زمین کبھی نہ بیچے گی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ زمین اس کے دو یتیم بچوں کی ہے اگر آج اس نے اسے بیچ دیا تو رقم ادھر ادھر لگ کر ضائع ہو جائے گی اور وہ بچے بھی زمین سے جائیں گے۔ بڑھیا کی بات اپنی جگہ درست تھی لیکن میرا مسئلہ بھی حقیقی تھا۔ میں اگر وہ زمین فیکٹری میں شامل نہ کرتا تو فیکٹری کی دو دیواریں ٹیڑھی رکھنی پڑتی تھیں، ایسے میں ساری فیکٹری کا سیٹ اپ خراب ہوتا تھا۔ ادھر وہ بڑھیا بھی اپنی بات پر اڑی رہی کہ وہ اسے نہ بیچے گی۔ میں دو ہفتے اس مسئلے کی وجہ سے پریشان رہا۔ روزانہ بڑھیا کو بلوا کر اس کی منتیں کرتا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ ان ہی دنوں میں مینیجر نے ایک مشورہ دیا کہ زمین کسی دو نمبر طریقے سے اپنے نام کروا لی جائے اور میں نے اس مشورے پر عمل کر ڈالا۔ ایک دن

وہ زمین بڑھیا کی تھی اور اس سے اگلے دن ہماری ہو چکی تھی۔

”وہ دو نمبر طریقہ کیا تھا جس سے آپ نے زمین ہتھیائی۔“ حافظ جی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی جس پر سیٹھ صاحب کو ہنسی آگئی۔

”حافظ جی۔“ سیٹھ نے انہیں بتایا۔ ”ہم جیسے لوگوں کے لیے ایسے کام زیادہ مشکل نہیں ہوتے۔ اس شہر کا کون ایسا بااثر آدمی ہے جس سے میرے تعلقات نہیں۔ تعلقات کی بنیاد پر ایسے کام بڑی آسانی سے کروائے جا سکتے ہیں۔ بہرحال زمین جب بڑھیا کے ہاتھ سے نکلی تو اسے ایسے لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ وہ روزانہ آتی چیختی، چلاتی، کام پہ مزدوروں کو گالیاں دیتی اور آخر جب کچھ نہ کر پاتی تو ڈوپٹہ اٹھا کر مجھے بددعائیں دیتی۔

مزدور اس کا مذاق اڑاتے اور نفرت سے اسے پرے دھتکارتے لیکن وہ باز نہ آتی۔ اصل حقیقت سب جانتے تھے لیکن میرے رعب کی وجہ سے چپ تھے۔ میں بھی چپ تھا۔ اپنے فائدے کے لالچ میں ہر شخص گونگا بہرہ بن جایا کرتا ہے۔

ایک روز میں فیکٹری کے دورے پہ گیا ہوا تھا۔ وہ اچانک اسی حالت میں میرے سامنے آگئی اور برا بھلا کہنے لگی۔ میں تھوڑی دیر تو اس کی یہ بک بک سنتا رہا پھر اسے ایک طرف کر کے آگے بڑھنے لگا۔ اسی لمحے اس نے نفرت سے مجھ پر تھوک دیا۔ میرا رنگ سرخ ہو گیا اور اندر سے نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ قریب تھا کہ میں اسے تھپڑ جڑ دیتا میرے عملے نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ بس حافظ جی! یقین کیجئے وہ دن اور آج کا دن روزانہ اس جگہ پر بائیں ہاتھ کے پچھلی طرف ایسی جلن ہوتی تھی جیسے کسی نے انگارہ لگا رکھا ہو۔ یہیں پہ اس کے منہ کا لعاب (تھوک) گرا تھا۔ میں نے اس واقعے کو اہمیت نہ دی اور بڑھیا کا حق واپس کرنے کی بجائے علاج معالجے کے پیچھے لگ گیا۔ علاج معالجے سے شفا تو نہ ہوئی البتہ لاکھوں روپیہ ڈاکٹروں کی فیسوں میں ضائع ہو گیا۔

اس رات بار بار میرے دل میں آئے کہ بڑھیا سے معافی مانگی جائے اسی سے یہ مسئلہ حل ہو گا۔ صبح میں نے اسی مینیجر کو بڑھیا کی تلاش میں دوڑایا۔ وہ قریبی بستی میں ایک چھپر کا مکان بنا کر رہ رہی تھی اس کی گلی میں کار نہ جاتی تھی میں پیدل وہاں پہنچا۔

اگرچہ اس واقعہ کو دس برس بیت چکے تھے اور اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ لگا اس سے معافی مانگنے اور اس کے آگے گڑگڑانے۔

مجھے نہیں یاد کب میرے آنسو نکلے اور کب میں رویا۔ اس نے فراخ دلی سے مجھے معاف کر دیا پھر محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری شفا کے لیے دعا بھی کی۔ میں نے بھی اس کا بدلہ ایسے دیا کہ دس مرلے کا ایک بنا بنایا مکان خرید کر اس کی چابیاں اسے تھما دیں۔ جہاں اب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خوشی سے رہ رہی ہے۔ تو یہ تھی حافظ صاحب ساری کہانی۔ اسی دن سے جلن کو آرام آنا شروع ہو گیا اور ہفتے دس دن یہ زخم ایسے بھر گیا جیسے یہاں کبھی تھا ہی نہیں اب میں بھی چین اور اطمینان کی زندگی گزار رہا ہوں۔“

سیٹھ صاحب اتنا کہہ کر مسکرانے لگے اور ان کی خوشی سے حافظ جی بھی خوش ہو گئے۔ اسی دوران مسجد میں اذان بلند ہونے لگی۔ ☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْوَدُوْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بہت محبت کرنے والا)

اَلْوَدُوْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو اپنے نیک بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں دو مرتبہ آیا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ان دونوں آیات کا خوب صورت ترجمہ آپ بھی پڑھیں۔

1- ''یقین رکھو! کہ میرا رب بڑا مہربان، بہت محبت کرنے والا ہے۔''
2- ''اور وہ بہت بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتے ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سب کو نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ جب اس نے ہمیں نعمتیں دی ہیں تو ہمیں بھی اس کے پسندیدہ کام کرنے چاہئیں۔ اس کی مخلوق سے محبت کریں، بے زبان جانور، چیونٹیاں، پودوں کو خواہ مخواہ نقصان نہ پہنچائیں، کیوں کہ یہ سب جانور اور پودے، اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں۔

رئیس اور اقبال

رئیس اور اقبال کی دوستی مثالی تھی۔ دونوں کے گھروں میں صرف ایک گلی کا فرق تھا۔ کبھی رئیس اس کے گھر آتا تو کبھی اقبال اس کی طرف جاتا۔ ان کی دوستی پہلی کلاس سے شروع ہوئی تھی اور آٹھویں جماعت تک ان کی دوستی گہری سے گہری تر ہو چکی تھی۔

رئیس کے پاس ایک رسالہ تھا جس میں کہانی کے انعامی مقابلے کا اعلان تھا۔ وہ اس میں حصہ لینا چاہتا تھا، کیوں کہ اسے کہانی لکھنے کا بہت شوق تھا۔ گزشتہ سال انعامی مقابلے میں اس نے تیسری پوزیشن لی تھی۔ اس مرتبہ وہ اول پوزیشن لینا چاہتا تھا، اس سلسلے میں وہ اقبال کے گھر پہنچا۔ کئی رسائل بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ مختلف آئیڈیاز کی تلاش میں تھا کہ اچھے سے اچھے آئیڈیے پر لکھ سکے۔

کافی دیر سے دونوں آئیڈیاز کے حصول کے لیے پرانے پرانے رسالوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ اچانک رئیس کی نظر ایک مضمون پر جم گئیں:

پیغام

''ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کی زیارت اور اس سے ملاقات کے لیے چلا، وہ دوسری بستی میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتے کو بٹھا دیا، تاکہ وہ اس کا انتظار کرے۔ جب وہ اس تک پہنچا تو فرشتے نے جو انسانی شکل میں تھا، اس سے پوچھا: ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

اس شخص نے کہا: ''اس بستی میں میرا بھائی ہے، اس سے ملنے جا رہا ہوں۔''

فرشتے نے کہا: ''کیا تمہارا اس پر کوئی حق ہے کہ جس کی وجہ

سے تم وہاں جا رہے ہو؟''
اس نے کہا: ''نہیں کچھ نہیں! بس میں اس سے اللہ جل جلالہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔''
فرشتہ نے کہا: ''میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ہوں اور یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ بھی تم سے اسی طرح محبت فرماتے ہیں جیسے تم اس سے محبت کرتے ہو۔''
یہ مضمون پڑھ کر وہ ٹھٹکا۔ اس نے وہ مضمون اقبال کے سامنے کر دیا، تاکہ وہ بھی پڑھ لے۔
''کیا کوئی اچھا آئیڈیا ملا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔
''نہیں تم پڑھو تو سہی۔''
''کیا اس آئیڈے پر لکھنا ہے؟'' اقبال نے پھر پڑھے بغیر ایک اور سوال کر ڈالا۔
''نہیں اس آئیڈے پر لکھنا نہیں ہے، بلکہ اس کو اپنانا ہے۔''
''کیا مطلب؟! کیا چیز اپنانی ہے؟'' اقبال نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور پھر اقبال وہ تحریر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔
رئیس، اقبال سے کہنے لگا:
''دیکھو اقبال! ہم کافی عرصے سے مل رہے ہیں، اب اگر میں تمہاری طرف آنے سے پہلے یہ نیت کر لوں اور تم میری طرف آنے سے پہلے یہ نیت کر لو تو مفت میں ثواب مل جائے اور ہم اَلْوَدُوْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ کے محبوب بن جائیں۔''
''تو پھر! ہو جائے آج سے نیت۔'' اقبال نے کہا۔
دونوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے دوستی مضبوط رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دیئے۔

آسان دُعا

اس پیاری دعا کو یاد کر لیجیے اور پھر روزانہ مانگیے۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں۔''

یاد رکھنے کی باتیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کے لیے اس کی مخلوق کا خیال رکھیے۔ مخلوق کو کسی بھی قسم کی تکلیف دینے سے بچیے۔
۲۔ جو دعا بتائی گئی ہے اسے خود بھی مانگیے اور دوسروں کو بھی بتائیں اور یاد کروائیں۔
۳۔ قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، لہٰذا اسے محبت سے پڑھنے کا شوق دل میں پیدا کریں۔
☆☆☆

مسنون دعائیں

کوئی کام شروع کرنے سے پہلے کہو
بسم اللہ (شروع اللہ کے نام سے)
چھینک آئے تو کہو
الحمد للہ (شکر اللہ کے لیے)
کچھ اللہ کے نام پر دو تو کہو
فی سبیل اللہ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں)
کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو کہو
ان شاء اللہ۔ (اگر اللہ نے چاہا)
کوئی اچھی خبر سنو تو کہو
سبحان اللہ (اللہ تعالیٰ پاک ہے)
کسی کو تکلیف ہو تو کہو
یا اللہ (اے میرے اللہ)
کسی کی تعریف کرنی ہو تو کہو
ماشاء اللہ (جو اللہ نے چاہا)
سو کر اٹھو تو کہو
لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)
شکریہ ادا کرنا ہو تو کہو
جزاک اللہ (اللہ تمہیں بدلہ دے)
کسی کو رخصت کرنا ہو تو کہو
فی امان اللہ (اللہ کی حفاظت میں)
جب خوش گواری ہو تو کہو
تبارک اللہ (اللہ تعالیٰ برکت والا ہے)
جب ناگواری ہو تو کہو
نعوذ باللہ۔ (اللہ تعالیٰ کی پناہ درکار ہے)
غلط کام پر افسوس کرنا ہو تو کہو
استغفر اللہ (اللہ سے معافی چاہتا ہوں)

جج: ''تم ہر بار ایک ہی گھر سے کیوں پکڑے جاتے ہو؟''
ملزم: ''جناب! میں اس گھر کا فیملی چور ہوں۔''

☆

استاد شاگرد سے: ''جس ملک میں بارش بہت زیادہ ہو وہاں کیا چیز زیادہ پیدا ہوتی ہے؟''
شاگرد: ''جناب! کیچڑ۔''
(ردا عدیل، لاہور)

☆

باپ (بیٹے سے): ''تم نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے۔''
بیٹا: ''فکر نہ کریں میں ابھی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

☆

ایک بچے نے دوسرے بچے سے کہا۔ ''آج مجھے پچاس پیسے کا سکہ ملا ہے۔''
دوسرے بچے نے کہا۔ ''وہ میرا تھا۔''
پہلا بچہ بولا۔ ''پچاس پیسے کا سکہ نہیں بلکہ نوٹ ہوتا ہے۔''
دوسرا بچہ: ''میں مذاق کر رہا تھا۔''

☆

استاد (طالب علم سے): ''بے بس'' کسے کہتے ہیں؟
طالب علم: ''جس کے پاس بس نہ ہو۔''
(ماریہ بتول، اٹک)

☆

ایک آدمی نے دوسرے سے کہا: ''اگر تم سامنے والی دکان سے کوئی چیز چرا کر لے آؤ تو میں تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔''
دوسرا آدمی فوراً گیا اور گھی کا ڈبا اٹھا لایا۔
پہلا آدمی: ''تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ میں پولیس والا ہوں۔ اب تم سیدھے جیل جاؤ گے۔''
دوسرا آدمی: ''تمہیں یہ سن کر مایوسی ہو گی کہ میں اس دکان کا مالک ہوں۔''

☆

ایک آدمی کنویں میں گر گیا۔ ایک پولیس اہل کار نے کنویں سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں سنی تو کنویں میں رسی ڈال کر اسے اوپر کھینچا۔ جب کنویں سے آدمی کا سر باہر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ انسپکٹر صاحب ہیں۔ پولیس اہل کار نے فوراً رسی چھوڑی اور سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''السلام علیکم۔''
(عینیہ۔ واہ کینٹ)

☆

استاد بچوں کو طبی امداد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پھر بولا۔ ''فرض کرو۔ میں تمہارے سامنے ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہوں تو تم کیا کرو گے؟'' سب بچے بیک آواز ہو کر بولے۔ ''چھٹی۔''
(محمد بن محمد طیب طوفانی، سرائے نورنگ)

☆

احمد: ''ابا جان سونا کہاں سے نکلتا ہے؟''
باپ: ''کان سے۔''
احمد: ''اس لیے ماسٹر صاحب ہر روز میرے کان مروڑتے ہیں۔''
(زینب بنت محمد طیب طوفانی، سرائے نورنگ)

☆

مجرم: ''حضور! میں بھوکا تھا۔ بے گھر تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ اس لیے میں نے چوری کی۔''
جج: ''تمہاری حالت قابل رحم ہے۔ میں چھ مہینے کے لیے تمہارے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

☆

ایک صاحب پل پر سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے دریا میں گر پڑے بڑی مشکل سے لوگوں نے انہیں باہر نکالا تو وہ جھنجھلا کر بولے۔ ''یہ سب میرے دماغ کا قصور ہے۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ میں تیرنا بھی جانتا ہوں۔''

☆

مسافر (قلی سے): ''مجھے ایسے ڈبے میں بٹھانا جہاں کوئی بات کرنے والا نہ ہو۔''
قلی: ''آپ فکر نہ کیجیے۔ میں آپ کو جانوروں کے ڈبے میں بٹھا دوں گا۔''
(احور کامران، لاہور)

ساحل سمندر والا گھر

ریل گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی کھیتوں، کھلیانوں اور ریلوے اسٹیشنوں سے گزرتی رہی اور کئی اسٹیشنوں پر رُکی بھی، لیکن ساحل سمندر کی طرف بڑھتی رہی۔ راستے میں اونچے پہاڑ، چاندی جیسے پانی سے بہتے دریا آئے اور کئی بڑے شہر بھی۔ آخر گاڑی ایک بڑے ویرانے میں آ گئی۔ سمندر کی مخصوص ہوا کھڑکی سے اندر گھس آئی۔ عزیق کہنے لگا کہ میں سمندر کی مہک کو دیکھے بغیر ہی پہچان سکتا ہوں لیکن وہ پہلے ایک دفعہ سمندر کے کنارے جا چکا تھا، اب اسے وہ تجربہ زیادہ یاد نہیں تھا۔ آخر ریل گاڑی ایک ویران سے چھوٹے ریلوے اسٹیشن پر رُک گئی، معاذ بولا۔ ''لو آخر ہم پہنچ ہی گئے۔ وہ دیکھو، صغیر ہمیں لینے آیا ہے۔ صغیر کیا تم پرانی گاڑی پر آئے ہو؟'' عزیق اور نایاب نے ایک عجیب سا آدمی اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کی جلد پر جیسے دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے دانت بہت سفید تھے لیکن بھینگا ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کسی اور سمت کو بھٹک رہے تھے۔ وہ ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آ رہی تھی جو نایاب سے کچھ ہی بڑی ہو گی لیکن اپنی عمر کے حساب سے اس کا قد لمبا تھا۔ اس کے سر کے بال بالکل معاذ کی طرح گھنگھریالے تھے حتیٰ کہ اس کے ماتھے کے بالوں پر معاذ کی طرح بودی بھی کھڑی تھی۔

عزیق نے سوچا کہ یہ لو ایک اور بودی والے بچے سے واسطہ پڑ گیا لیکن یہ زیادہ غصیلی لگتی ہے۔ یہ ضرور تزئین ہو گی اور واقعی وہ تزئین ہی تھی۔ وہ صغیر کے ساتھ معاذ کو لینے آئی تھی لیکن ایک بہت ہی پرانی کار میں۔ وہ چلتے چلتے اچانک رُک گئی اور حیرانی سے عزیق اور نایاب کو دیکھنے لگی۔ عزیق تو اسے دیکھ کر مسکرا دیا لیکن نایاب تزئین جیسی پُراعتماد اور بنی ٹھنی لڑکی کو دیکھ کر بھائی کے پیچھے ہو گئی۔ تزئین کو سب سے زیادہ حیرت کیکی کو دیکھ کر ہو رہی تھی جو صغیر کو حکم دے رہا تھا کہ اپنے پیروں کو صاف کرے۔ صغیر نے غصے سے کہا۔ ''جاؤ منہ دھو کر آؤ!'' وہ توتے سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے انسانوں سے کی جاتی ہیں۔ کیکی نے اپنی چھاتی آگے کو نکالی اور صغیر پر کتے کے بھونکنے کی آواز نکالنے لگا۔ صغیر حیران رہ گیا، اس نے معاذ سے پوچھا۔ ''کیا یہ پرندہ ہی ہے۔'' معاذ نے جواب دیا۔ ''ہاں! کیوں نہیں۔'' ''اچھا! صغیر یہ اٹیچی کیس بھی کار کی ڈکی میں رکھوا دو، میرے دونوں مہمانوں کا ہے۔'' صغیر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا یہ رہنے کے لیے آئے ہیں، تمہاری چچی نے تو مجھ سے ان کے آنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔'' تزئین نے پوچھا۔ ''بھیا! یہ کون ہیں؟'' وہ نزدیک آ کر بولی۔ ''میرے خطوں والے دوست جو

رائے صاحب کے پاس رہتے تھے لیکن یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" پھر اس نے بہن کو آنکھ کے خفیف اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ اسے تب سمجھائے گا جب صغیر پاس نہیں ہو گا۔ پھر اس نے تزئین کو یاد دلایا کہ یہ عریق اور نایاب ہیں جن کے بارے میں وہ پہلے ہی بتا چکا ہے۔ تینوں بچوں نے سر کو خفیف سی حرکت سے خم کیا اور پھر سب دیگچوں والی کار میں سوار ہو گئے۔ ان کے دونوں اٹیچی کار کی ڈکی میں تھے اور پھر جس طرح صغیر نے گاڑی چلائی، وہ نایاب کے لیے سب سے خطرناک بات تھی۔ وہ کار میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی، ڈری سہی۔

ان کی کار نے اپنا سفر ایک ایسے رستے پر جاری رکھا جس کے اردگرد سنگلاخ چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ پُرشکوہ چوٹیاں جا بجا تھیں، ماسوائے کچھ مقامات کے جہاں ویرانہ تھا۔ یہ ساحل سمندر بہت ویران اور اجاڑ لگتا تھا۔ وہ راستے میں شکستہ اور تباہ شدہ گھروں کو دیکھ رہے تھے۔ معاذ نے بتایا کہ یہ جنگ میں جلائے گئے گھر ہیں، میں ان کے متعلق تمہیں بتا چکا ہوں اور انہیں کسی نے دوبارہ تعمیر نہیں کیا۔ صرف ہمارے گھر کے قریب والی جگہ جنگ سے بچی تھی۔ تزئین بولی۔ "وہ دیکھو، وہ چٹان ہے، جس پر ہمارا گھر تعمیر ہوا ہے۔" تزئین کے بتانے پر بھی ایک اونچی چٹان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر مڑتے ہوئے انہیں دُور ایک مینار نظر آیا جس کے متعلق بچوں کو لگا کہ وہ معاذ کے گھر کا حصہ ہو سکتا ہے۔ معاذ بتانے لگا کہ ہمارا گھر ایسا بنایا گیا تھا جو سمندر کی لہروں سے بچا رہے لیکن طوفان کے دنوں میں لہروں سے بننے والی پھواریں اتنی ہی تیز ہوتی ہیں جتنی خود لہریں۔ نایاب اور عریق کو یہ سب بڑا حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ یہ بڑی زبردست چیز تھی کہ کسی ایسے گھر میں رہا جائے جس کی دیواروں سے سمندر کی لہریں سر پٹختی ہوں۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہے تھے کہ کاش ان کے یہاں قیام کے دوران کوئی بڑا سا سمندری طوفان آئے۔ اچانک صغیر بولا۔ "کیا تمہاری چچی تم سب کا انتظار کر رہی ہیں؟ انہوں نے مہمانوں کا مجھے نہیں بتایا تھا۔"

وہ دراصل بہت حیران تھا کہ یہ دو مہمان کہاں سے ٹپک پڑے ہیں۔ معاذ بولا۔ "انہوں نے اگر ذکر نہیں کیا تو یہ بڑی حیرانی والی بات ہے۔" کیکی کا یہ سن کر پھر قہقہہ نکل گیا لیکن صغیر نے اس قہقہے پر خاصا ناک منہ چڑھایا۔ لگتا تھا کہ اس کی دوستی کیکی کے ساتھ ہونے والی نہیں تھی۔ عریق کو بھی یہ بات بالکل پسند نہیں آ رہی تھی جس طرح صغیر کیکی کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک تزئین نے چیخ ماری اور معاذ کو دھکا دے کر بولی۔ "اوہ! تمہاری گردن کے پیچھے ننھا منا چوہا پھر رہا ہے۔ میں نے تمہاری گردن کے پیچھے سے اس کو جھانکتے دیکھا ہے۔ اس کو گاڑی سے باہر پھینکو۔ تمہیں معلوم ہے میں چوہے برداشت نہیں کر سکتی۔" معاذ ناراضی سے بولا۔ "اپنا منہ بند کرو اور بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔" اتنی بات تزئین کو طیش دلانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے معاذ کا کالر پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تاکہ چوہے کو باہر نکال کر گاڑی سے باہر پھینک دے۔ معاذ نے بھی جواب میں تزئین کو دھکا دیا جس سے اس کا سر گاڑی کے دروازے میں لگا۔ اب تزئین کی باری تھی، اس نے معاذ کو بلا جھجک ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ عریق اور نایاب حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تزئین بولی۔ "جانور! میری خواہش تھی کہ کاش تم واپس نہ ہی آتے۔ اپنے دونوں عجیب دوستوں کو ساتھ لے کر رائے صاحب کے پاس واپس لوٹ جاؤ۔" معاذ کہنے لگا۔ "میرے مہمان عجیب نہیں ہیں، یہ بہت اچھے ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ صغیر ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا اس نے اپنا منہ تزئین کے کان کے قریب کر لیا اور تزئین کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

"یہ رائے صاحب کی دسترس سے فرار ہو کر آئے ہیں اور میں نے ہی انہیں آنے کے لیے کہا ہے، ان کے تایا ہماری چچی کو باقاعدہ ان کے رہنے کے عوض رقم دیں گے اور اس رقم سے چچی گھر کے بل ادا کریں گی جن کے متعلق تم نے خط میں بتایا تھا۔" تزئین کا غصہ اتنی ہی تیزی سے غائب ہو گیا جتنی تیزی سے ظاہر ہوا تھا۔ وہ اب انہماک سے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھ رہی تھی اور ساتھ اپنے دکھتے سر کو سہلا بھی رہی تھی۔ "چچی کیا کہیں گی؟ یہ کہاں سوئیں گے؟ لیکن یہ مسئلہ مزے کا ہو گا۔" وہ سوچ رہی تھی۔ صغیر پتھریلے اور دیگچوں والے رستے پر گاڑی بھگاتا رہا۔ عریق حیران تھا کہ اس طرح کی ڈرائیونگ سے گاڑی اب تک ٹکڑوں میں تقسیم کیوں نہیں ہوئی۔ وہ پہلے چٹان پر سیدھا چڑھے اور پھر ایک خفیہ ڈھلوان پر سفر کرتے ہوئے گھر تک پہنچے۔ وہاں اچانک ہی غرّاتا ہوا سمندر ان کے سامنے تھا اور اوپر سامنے ان کا گھر تھا جو چٹان کی اونچائی کے وسط میں واقع تھا یہ ایک انتہائی حیران کن جگہ تھی، کئی سال پہلے

یہاں دو مینار ہوا کرتے تھے جن میں سے ایک گر چکا تھا لیکن دوسرا ابھی پورے طمطراق سے کھڑا تھا۔ گھر بڑے بڑے مٹیالے پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ وہ بہت بڑا لیکن آنکھوں کو لبھانے والا نہیں تھا لیکن پھر بھی پُرشکوہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک مغرور اور ناراضی بھرا تاثر لیے سمندر کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا جیسے بے چین سمندر کا مقابلہ کر رہا ہو۔ عزیق نے نیچے پانی پر نظر دوڑائی تو اسے مختلف اقسام کے سمندری پرندوں کے جھنڈ دکھائی دیئے عزیق کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ ہزاروں پرندے، لاکھوں پرندے، اس نے سوچا کہ وہ پورے ذوق و شوق سے پرندوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گا۔ ان کے گھونسلے ڈھونڈے گا اور سکون سے ان کی تصویریں کھینچے گا، کیا مزے کا وقت ہو گا۔ ایک عورت دروازے پر آئی اور حیرت سے چاروں بچوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کمزور سی تھی اور اس کے بال ریتلے رنگ کے الجھے ہوئے تھے۔ وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ معاذ چلایا۔ ''سلام چچی! میں واپس آ گیا ہوں۔'' وہ دوڑتا ہوا پتھریلے راستے پر آ رہا تھا۔ چچی نے معاذ کو پیار کیا اور کہنے لگیں۔ ''وہ تو میں دیکھ رہی ہوں لیکن تمہارے ساتھ کون ہے؟'' معاذ بولا۔ ''چچی! یہ میرے دوست ہیں، یہ گھر نہیں جا سکے۔ ان کے تایا کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، اس لیے میں انہیں ساتھ لے آیا ہوں۔ ان کے تایا ان کے یہاں رہنے کے اخراجات برداشت کریں گے۔'' چچی یہ سن کر تیزی سے بولیں۔ ''لیکن تم ایسے کیسے کر سکتے ہو اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر۔ یہ کہاں سوئیں گے، تمہیں پتا ہے ہمارے گھر میں مہمانوں کو ٹھہرانے کا کوئی کمرہ نہیں ہے۔'' معاذ نے کہا۔ ''یہ مینار والے کمرے میں سو جائیں گے۔'' مینار والا کمرہ، یہ ذکر سن کر عزیق اور نایاب کی باچھیں کھل گئیں۔ چچی دبے دبے لہجے میں بولیں۔ ''وہاں کوئی بستر نہیں ہے، انہیں واپس جانا ہو گا۔ یہ آج رات ادھر رہیں اور صبح واپس چلے جائیں۔'' نایاب روہانسی ہو گئی تھی۔ چچی کے لہجے میں بڑی سختی تھی جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یہاں آنے میں بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ عزیق نے یہ دیکھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ واپس جانے والا نہیں۔

وہ اُڑتے، چکر کاٹتے، لہراتے پرندوں کے جو مناظر دیکھ چکا تھا، اس نے اس کے دل میں ان جانی خوشی بھر دی تھی۔ وہ چٹان پر لیٹ کر انہیں غور سے دیکھنا چاہتا تھا، وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ تمام گھر کے اندر داخل ہوئے۔ صغیر ان کے اٹیچی لے کر آ رہا تھا اور چچی نفرت سے کیکی کو گھور رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''ایک تو تا بھی ہے۔ ایک شور مچانے والا پرندہ!'' ''کیا تمہارے گندے مندے سے پالتو جانور کافی نہیں تھے معاذ! جواب ایک تو تا بھی تشریف لے آیا ہے۔'' اچانک کیکی بولا۔ ''بے چاری چچی، بے چاری بوڑھی چچی!'' چچی حیران ہو کر توتے کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ مجھے کیسے جانتا ہے'' کیکی یہ نام نہیں جانتا تھا بلکہ خود چچی کئی دفعہ اپنے آپ کو بوڑھی بے چاری چچی کے نام سے پکارتی رہتی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس نے بوڑھی عورت پر اپنا ایک تاثر قائم کر لیا ہے تو اس نے انہی الفاظ کو بہت نرمی سے دوبارہ ادا کیا۔ لگتا تھا جیسے وہ رونے کے قریب ہے۔ ''بے چاری چچی، بے چاری بوڑھی چچی!'' چچی مزید متاثر ہو کر اب کیکی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔ کام کرتے کرتے چچی کئی دفعہ بیمار ہوئیں، تھکیں یا ان کو جھڑ کا گیا لیکن کبھی کسی نے نہ ان سے افسوس کیا اور نہ ہی ہمدردی کا ایک لفظ کہا۔ اب وہ کھڑی تھیں اور ایک توتا ان کے لیے ہمدردی کے بول بول رہا تھا اور دُنیا میں کسی بھی شخص سے زیادہ ان پر مہربانی کے پھول برسا رہا تھا۔ چچی کو عجیب بھی لگ رہا تھا لیکن وہ خوش بھی ہو رہی تھیں۔ وہ معاذ سے بولیں۔ ''معاذ! تم ایک سونے والا گدا اوپر مینار والے کمرے میں لے جانا اور لڑکے کے ساتھ ہی آج رات سو جانا۔ اس کا نام کیا ہے؟'' لڑکی تزئین کے ساتھ سو سکتی ہے۔ گدا چھوٹا ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر تم مہمانوں کو میرے پوچھے بغیر لے آؤ گے تو میں تیاری کیسے کروں گی۔''

بچے کھانا کھانے لگے، کھانا بہت مزیدار تھا۔ چچی کھانا بہت مزے کا بناتی تھیں۔ یہ چائے اور دوپہر کے کھانے کا امتزاج تھا اور بچوں نے اسے بڑی رغبت سے کھایا۔ سارا دن ناشتے کے بعد انہوں نے صرف وہ سینڈوچ بانٹ کر کھائے تھے جو معاذ کو رائے صاحب نے کھانے کے لیے دیئے تھے۔ ظاہر ہے ایک سینڈوچ تین بچے بانٹ کر کھائیں گے تو ان کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ تبھی تزئین چھینکی اور کیکی نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہنے لگا۔ ''تمہارا رومال کدھر ہے؟'' چچی نے توتے کی طرف حیران لیکن متاثر کن

نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی۔ ''میں نے ہمیشہ یہ بات تزئین سے کہی ہے، مجھے تو یہ توتا بہت ذہین لگتا ہے کیکی چچی کی تعریف سے پھولا نہ سمایا اور چہکا۔ ''بے چاری چچی، بے چاری پیاری چچی!'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پیار سے ایک طرف پھینک دی اور اس کی چمک دار آنکھوں میں چچی کے لیے محبت اُمڈی ہوئی تھی۔ معاذ نے عتیق کے کان میں آہستگی سے کہا۔ ''چچی تم سے زیادہ تمہارے توتے کو پسند کرتی ہیں۔'' کھانے کے بعد چچی معاذ کو چچا کے مطالعے کے کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر چلی گئیں۔ اس کے چچا کاغذوں سے بھری الماری کے ایک خانے پر جھکے ہوئے تھے اور ایک خوردبین سے ان کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے۔ وہ معاذ کو جیسے دانت پیستے ہوئے کہنے لگے۔ ''تو تم دوبارہ واپس آ گئے ہو۔ اب تمیز سے رہنا اور میرا کوئی کام خراب نہیں کرنا۔''

''میں ان بقایا چھٹیوں میں بہت مصروف ہوں۔'' چچی نے چچا کو مخاطب کر کے کہا۔ ''آصف صاحب! معاذ اپنے ساتھ دو مہمان بھی لایا ہے اور ایک عدد توتا بھی، اور وہ چاہتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں۔'' چچا آصف فوراً بولے۔ ''وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے، توتا رہ سکتا ہے۔ تم توتا رکھنا چاہو، تو رکھ لو۔ نہ رکھنا چاہو، تو نہ رکھو۔ میں مصروف ہوں۔'' وہ اپنے کاغذوں پر جھک گئے۔ چچی نے ٹھنڈی سانس لی اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔ ''وہ اپنے ماضی میں اتنا مگن ہے کہ اپنا حال بھول چکا ہے، مجھے لگتا ہے مجھے خود رائے صاحب سے بات کرنی ہو گی، وہ ان بچوں کے متعلق پریشان ہو رہا ہو گا۔'' وہ ٹیلی فون کرنے گئیں۔ معاذ ان کے پیچھے تھا، وہ سننا چاہتا تھا کہ اس بارے میں رائے صاحب کیا کہتے ہیں؟ ایک کمرے سے تزئین نے بھی جھانکا اور معاذ نے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا۔ اگر رائے صاحب ناراض ہوئے اور انہوں نے عتیق اور نایاب کو واپس لینے سے انکار کر دیا اور ہو سکتا ہے رائے صاحب اتنی رقم چچی کو بھجوا دیں جس سے چچی کا عتیق اور نایاب کو واپس بھجوانے کا ارادہ تبدیل ہو جائے۔ (بقیہ آئندہ)

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

ہادیہ خالق، ڈیرہ غازی خان۔ حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ محمد علی اشرف آرائیں، نفیسہ فاطمہ قادری، کاموکی۔ خانیوال۔ محمد ولید، لاہور۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔ زنیرہ بانو، کمالیہ۔ جویریہ خالد، اسلام آباد۔ سید بدرالاسلام، میرپور۔ سیدہ ہانیہ رئیس، کراچی۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ محمد عزیر، ٹیکسلا۔ عالم شیر، ساہیوال۔ محمد ہاشم ظفر، اسلام آباد۔ رضوان اشہد، پشاور۔ کشف الوریٰ ازل، میانوالی۔ فاطمہ احمد، راول پنڈی۔ صفی اللہ، قلعہ دیدار سنگھ۔ گل فاطمہ، راول پنڈی۔ محمد مجیر خان، ڈیرہ غازی خان۔ روحاب عمران، اسلام آباد۔ کنزا اکرم، لاہور۔ محمد حسنین طوروی، جہلم۔ حنین بٹ، ظفروال۔ ثانیہ اظہر، لاہور۔ ربیعہ توقیر، کراچی۔ ایمن گل، میانوالی۔ دانیال سخاوت، راول پنڈی۔ فاطمہ نواز، گوجرانوالہ۔ محمد حارث، خان پور۔ فاطمہ کلیم، شیخوپورہ۔ علینا اختر، کراچی۔ زویا رفاقت، بھمبر۔ مریم ملک ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ محمد ارسلان رضا، لودھراں۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ عبدالفاطر ڈار، گوجرانوالہ۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ محمد یاسر، کرک۔ مقصود اختر، لاہور۔ مریم عثمان، راول پنڈی۔ نشاء صفی، لاہور۔ محسن کبریا، سرائے عالمگیر۔ طیبہ ملک ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ بختاور معزز علی، لاہور۔ سید مصحف عون علی، میانوالی۔ حسیب الرحمٰن حسینی، خانیوال۔ ثمین مقصود، لاہور۔ نوروفیہ اشفاق، لاہور۔ عبدالرحمٰن جمن طارق محمود، گوجرانوالہ۔ علیاء وسیم، ڈیرہ غازی خان۔ قاسم الیاس، ملتان۔ نمرہ ظہور، فیصل آباد۔ سیدہ ہانیہ رئیس، کراچی۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ ثنیہ عمران، راول پنڈی۔ الوینا اشرف، منڈی بہاؤ الدین۔ انیسہ محمد افضل، گوجرانوالہ۔ مسفرہ علی بنت رانا رضوان علی، خوشاب۔ کنزہ منال، فیصل آباد۔ محمد قمر الزمان، قائد آباد۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ عزیر بن خالد احمد، کمالیہ۔ خاکہ وقار، فیصل آباد۔ نمرہ رضوان، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ حسیب خان، عائشہ گل، اسلام آباد۔ کبشہ ادریس، کراچی۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ عباد الرحمٰن، مانسہرہ۔ انس امین، لاہور۔ حرا ارشد، سارا ارشد، سرگودھا۔ ایاز احمد، طلحہ قطب، لاہور۔ فضہ گل، نوشہرہ۔ محمد نبیل صدیقی، کراچی۔ سید حماد حیدر، ٹیکسلا۔ سارہ جاوید، لاہور کینٹ۔ ثمرین اقبال، لاہور۔ زویا ناہید، سیالکوٹ۔ جاوید جدون، کراچی۔ صوفیہ قدیر، گجرات۔ شازیہ نورین، ڈیرہ غازی خان۔ بنین، ساہی وال۔ محمد احمد، لاہور۔ کظیمہ زہرہ، احور کامران، ظل ہما، نوشہرہ۔ صدیق خان، مری۔ تحریم سلطان، کوئٹہ۔ عاصمہ انور، لاہور۔ صالحہ حسین، ملتان۔ ثمن درین، راول پنڈی۔

نرالا انداز

رمیصا حسن، پشاور

آج عصر کی نماز کے بعد ہی علی اور اس کے دوستوں کی پارٹی اپنی نہایت اہم میٹنگ کی غرض سے علی کے کمرے میں موجود تھے۔

ہم م! میرا خیال ہے خالد اور ہاشم کا گھر بالکل مناسب رہے گا اس دن کے لیے۔'' ''انور جو سب سے زیادہ پرجوش دکھائی دے رہا تھا، چوکور میز کی ایک جانب کرسی کھینچتے ہوئے بولا۔ ''دن نہیں یار! رات مناسب ہے، رات کو منانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ جوگی نے میز کے دوسرے کونے سے ہانک لگائی۔

''میری مانو، تو اس دفعہ کوئی زبردست سی ون ڈش رکھتے ہیں، مزے مزے کے کھانوں میں ہم اس دن کو بہت انجوائے کریں گے!'' عارف عرف ''موٹو'' نے دیدے گھما گھما کر کہا تو سب لگے اسے گھورنے۔

''علی، ویسے تم نے بتایا ہی نہیں، کون سا نیا آئیڈیا تم بتانے جا رہے تھے؟'' ہاشم نے تب سے خاموش بیٹھے علی کو مخاطب کیا۔

''میں نے سوچا تھا، اس مرتبہ کچھ نیا پلان بناتے ہیں، جو پہلے کسی اور نے نہ کیا ہو تاکہ ہمارے اسٹیٹس اور تصویریں فیس بک پر اس دن سب سے مختلف ہوں اور لائیکس سب سے زیادہ!'' سب نے تائیدی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا مختلف ہم کیا سرانجام دیں گے، جو اس دن کسی نے نہ کیا ہو؟ خالد نے اہم نکتہ اٹھایا۔

''ہم مل کر گرین اور وائٹ بڑا سا کیک آرڈر کرلیں گے! موٹو کو پھر کھانے کی فکر لگ گئی۔

''خدا کے واسطے موٹو! کھانے کے علاوہ کہیں اور بھی ذہن لڑا لیا کرو!'' جوگی نے کہا تو موٹو منہ بسور کے بیٹھ گیا۔

''آئیڈیا! انور نے چٹکی بجائی۔ ''ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا کر باری باری اس پر سب ایک ایک ملی نغمہ گائیں گے۔''

''تو پھر میں ابھی سے اعلان کر رہا ہوں کہ اگر انور گائے گا تو میں نہیں آؤں گا! فضلو بولا تو انور اس کی طرف گھوما۔ ''کیوں؟؟''

''کیوں کہ مجھے کان بہت عزیز ہیں اور میں انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔'' سب ہنسنے لگے۔ ''اسی اثناء میں علی کے دادا جان کمرے میں وارد ہوئے۔

السلام علیکم دادا جان! سب یک زبان بولے۔

وعلیکم السلام! بچو یہ چوکور میز کانفرنس کس مقصد کے لیے جاری ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''دادا جان ہم 14 اگست کے لیے پلان بنا رہے ہیں اور اسی حوالے سے سب اکٹھے ہوئے ہیں۔'' ہاشم سب سے پہلے بولا۔ ان سب کی دادا جان سے خوب گاڑی چھنتی تھی، جی ہاں! ہم اس دفعہ کچھ نئے اور مختلف انداز میں اسے منانے کا سوچ رہے ہیں۔'' علی نے کہا تو موٹو پھر چپ نہ رہ سکا۔ ''اور ون ڈش پارٹی سب سے مختلف رہے گی۔'' مگر سب نے اسے نظرانداز کیا۔

''ہوں! مختلف...... تو پھر کیا سوچا! دادا جان ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''ابھی تک تو بحث و مباحثہ ہی جاری ہے۔''

''دادا جان آپ ہی کچھ بتایئے۔'' خالد فکرمندی سے بولا۔

''بچو! میرے پاس آپ سب کے لیے ایک انوکھا اور بہترین پلان ہے۔ اپنی مدد آپ یہ سن کر سب کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ پھر دادا جان کا پلان سن کر سب خوشی خوشی اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔

دوسرے روز علی، انور اور خالد تو دادا جان کے ساتھ ضروری خریداری کرنے کے لیے بازار کی جانب چل پڑے۔ جب کہ بقیہ سب دوست دو ٹولیوں میں بٹ گئے اور پوری کالونی میں ایک ایک گھر کی گھنٹی بجا کر سب بچوں کو 14 اگست کی صبح کالونی کے میدان میں جمع ہونے کا بتانے لگے اور یہ بھی کہ اس دفعہ سب مل کر اکٹھے آزادی کا دن منائیں گے۔

14 اگست کی صبح سویرے ہی پورا میدان بچوں سے تقریباً بھر چکا تھا جب ایک طرف سے دادا جان اپنے دیرینہ دوست ماسٹر صاحب کے ہمراہ آتے دکھائی دیئے...... دادا جان سب کے سامنے بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے اور سب پر ایک مسکراتی

طائرانہ نگاہ ڈالی، سب بچے بے چینی سے انہیں تک رہے تھے۔

''میرے پیارے بچو! آج کا دن چوں کہ ہمارے عزیز وطن کی آزادی کا دن ہے، اس لیے ہمیں اس خاص دن کو پاکستان کی فلاح و بہبود کے نام کرنا چاہیے۔ اس دن ہمیں مختلف طریقوں سے خود کو بہلانے کی بجائے اپنے پاکستان کے لیے کچھ نفع بخش کام کرنے چاہئیں، اسی لیے ہم نے مل کر ایک پلان بنایا ہے کہ اس دن کو خاص کرنے کے لیے ہم مل کر کوئی مفید کام کریں چوں کہ وطن عزیز کی صفائی ستھرائی میں انتہائی لاپروائی برتی جاتی ہے، اسی لیے ہم نے سب سے پہلے اپنی کالونی کی صفائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسری جانب ہمارے پیارے ملک میں سبز پودوں اور درختوں کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے پہلی اینٹ کے طور پر ہم نے اپنی کالونی میں پودے اور بیج لگانے کا سوچا، آپ کا کیا خیال ہے؟''

سب بچوں نے پرجوش نعرہ لگایا تو ماسٹر صاحب بلند آواز میں بولے۔ ''شاباش بچو! چلو پھر شروع کریں۔''

بچوں کو تین پارٹیوں میں تقسیم کیا گیا، پہلی پارٹی ماسٹر صاحب کے ہمراہ صفائی کی مہم پر روانہ ہوئی۔ بڑے بڑے شاپر، خالی بالٹیاں جھاڑو وغیرہ سے لیس ہو کر ہاتھوں پر پلاسٹک کے دستانے چڑھائے، انہوں نے نہایت تن دہی سے اپنا کام شروع کیا۔ بعض جھاڑو پھیر کر کچرا جمع کر کے بڑے شاپر میں ڈالتے اور اگلے انہیں بالٹی میں منتقل کر کے میونسپلٹی کی جانب سے رکھے گئے بڑے بڑے ڈرم میں گرا آتے۔ لڑکیاں اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔

دوسری پارٹی دادا جان کی سربراہی میں بیلچے، کدال، مختلف چھوٹے چھوٹے پودے اور بیج لیے معین جگہوں پر شجرکاری کرنے اور بیج بونے لگے۔ موٹو اور فضلو اس ٹیم میں نمایاں تھے۔ باقی بچوں پر حکم صادر کرتے ہوئے دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔

جب کہ تیسری پارٹی جو قدرے چھوٹے عمر کے بچوں پر مشتمل تھی، جوگی اور انور کے ساتھ پانی کے برتن (watering pot) لیے نئے اور پرانے پودوں کو پانی سے سیراب کر رہے تھے اور کچھ بچے صاف ستھری گلیوں میں ہلکا ہلکا پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔

دوپہر تک سب ہی بچے فارغ ہو چکے تھے۔ پوری پروفیسر کالونی اجلی اور چمکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سارے بچے خوشی سے نہال واپس میدان کی طرف آئے تو اس کا منظر بھی بدلا ہوا تھا۔ صاف ستھرے میدان میں گویا ہر جانب سبز جھنڈیوں کی بہار اتر آئی تھی۔ ایک کونے میں لمبی میزوں کی قطار پر انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دادا جان کی جانب سے بچوں کے لیے سرپرائز تھا۔

علی، خالد اور ہاشم سب بچوں میں یوم آزادی کے بیجز تقسیم کرنے لگے۔ ''ارے موٹو! کدھر بھاگے جا رہے ہو؟ اپنا بیج تو لیتے جاؤ۔'' مگر موٹو سنی ان سنی کر کے سب سے پہلے کھانے کی میز پر پہنچا۔ ''ابھی آیا ہے یوم آزادی کا اصل مزا۔'' موٹو نے ایک بڑا نوالہ نگل کر کہا تو سب نے قہقہہ لگایا۔ اور درمیان میں نصب سبز ہلالی پرچم تیز ہوا کے جھونکے سے لہرانے لگا۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

زندگی...... ایک امانت

زنیرہ بانو، کمالیہ

وہ آپریشن تھیٹر کے باہر پریشان حال کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے ایک فقرے نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

''ہم اس کی بیماری سے لاعلم ہیں۔ اب آپ صرف اللہ پر بھروسہ رکھیں اور دعا کریں۔''

دعا...... صرف دعا......! چار سال پہلے بھی وہ اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا لیکن اس وقت کردار مختلف تھے۔ اس کی بوڑھی ماں اس وقت بستر پر پڑی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس وقت بھی ڈاکٹر کا یہی جملہ تھا۔ ''بس آپ دعا کریں۔'' وہ اور کیا کرتا۔ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اب تو وہ ہر وقت دعاؤں میں مشغول رہنے لگا لیکن شاید تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اس کی ماں صبح چار بجے خالق حقیقی سے جا ملی۔ وہ بے چارا رات کا تھکا ماندا تھا۔ صبح تین بجے کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی تھی لہٰذا وہ آخری بار ماں کا چہرہ بھی نہ دیکھ پایا۔

وہ اپنی ماں کو کھو چکا تھا اور اب اس کے سامنے اس کا بیٹا زندگی کے آخری مرحلے پر تھا۔ اس کے بڑھاپے کا سہارا...... وہ جیسے تیسے گھر پہنچا۔ اس کی بیوی اس کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا؟ تمہارا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟ کیا میرا بیٹا ٹھیک ہے؟ کیا ہوا ہے میرے لال کو؟'' اس نے اپنی بیوی کو تسلی دینی چاہی مگر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ''کچھ ٹھیک نہیں، کچھ بھی تو ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔ اب صرف دعا پر گزارا ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے دن رات دعائیں کرنا شروع کر دیں لیکن شاید

قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ان کا بیٹا بھی ان کی نظروں کے سامنے دم توڑ گیا۔ کعب کا رویہ بھی عجیب ہوتا چلا گیا تھا۔ مسجد میں بھی کبھی کبھار نظر آتا۔ اس کا رویہ بھی اکھڑا اکھڑا سا ہونے لگا۔

ایک شام اس کا پرانا دوست عکرمہ اس کے گھر آیا ہوا تھا۔ بات چیت جاری تھی کہ عصر کا وقت ہوگیا۔ عکرمہ نے کہا۔ ''چل بھئی کعب، عصر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ اکٹھے نماز پڑھنے چلتے ہیں۔'' ''تم چلو میں بعد میں آتا ہوں۔'' ''تمہیں ہو کیا گیا ہے کعب، میں تمہارا رویہ نوٹ کر رہا ہوں کافی دن سے...... اکھڑے اکھڑے رہتے ہو۔ نمازوں میں بھی غیر حاضر ہو۔ عمر کی موت......
ابھی وہ بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا: ''ہاں میں بدل گیا ہوں بہت سی اموات دیکھی ہیں میں نے...... ماں کی موت پر صبر کھا گیا، باپ کی موت پر بھی لیکن اب صبر نہیں ہوتا ہے۔ پانچ وقت کا نمازی تھا لیکن اللہ نے......

عکرمہ کی برداشت کی حد ختم ہوئی تو وہ چلایا۔ ''بس کعب بس۔ اللہ نے تمہیں سب کچھ دیا ہے گھر، پیسہ، بیوی...... سب کچھ۔ ان کو دیکھ جن کے پاس یہ بھی نہیں ہے۔ یہ زندگیاں اللہ نے ہی ہمیں عطا کی ہیں۔ ایک امانت ہے یہ...... اور اس کی واپسی لازمی ہے۔ تمہارے بیٹے کو اللہ نے زندگی عطا کی اور اپنی مرضی سے لے لی تو دکھ کی کیا بات؟ اس نے تمہیں ایک امانت دی تھی اور اب واپس لی ہے۔ ہوش میں آ جا کعب! اللہ ناشکرے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔'' کعب خاموش ہوگیا۔ پھر وہ اٹھا اور چل دیا۔ عکرمہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''مسجد۔'' اس نے شکر ادا کیا۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

بچت

زوبیا رفاقت، آزاد کشمیر

''احمد اٹھو۔ جلدی کرو۔ اسکول سے آج ہم لوگ پھر لیٹ ہو گئے ہیں۔'' احمد کی بہن حانیہ نے احمد کو جھنجھوڑا۔ ''ابھی بہت وقت پڑا ہوا ہے سونے دو۔'' ''ارے چھ بج کر چالیس منٹ ہو چکے ہیں۔'' حانیہ نے کہا اور احمد ایک دم سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ پھر احمد نے اسکول یونی فارم پہنا اور ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ احمد نے ناشتا کیا اور اسکول کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں اسی کوشش میں تھے کہ جلدی جلدی اسکول پہنچ جائیں۔ لیکن تیز بھاگنے کے باوجود بھی جب وہ لوگ اسکول پہنچے تو پورے آٹھ منٹ لیٹ تھے۔

ارے کہاں جا رہے ہو؟ پہلے جرمانہ تو جمع کراؤ۔ اسکول کے پرنسپل نے ان دونوں سے لیٹ آنے کا جرمانہ مانگا تو احمد اور حانیہ نے بیس بیس روپے اسکول کے پرنسپل کے ہاتھ میں تھما دیے اور منہ بسورتے ہوئے کلاس میں چلے گئے۔

احمد اور حانیہ روزانہ اسکول لیٹ آتے تھے اور پھر جو پیسے وہ کھانے کے لیے لاتے تھے وہ جرمانے کے طور پر جمع کرا دیتے تھے۔ اگلے دن حانیہ صبح صبح تیار ہوئی اور ناشتا کر کے احمد کا انتظار کیے بغیر جلدی سے اسکول آ گئی جب کہ احمد میاں بدستور لیٹ آئے اور جرمانہ جمع کرانے لگے۔

ایک دن احمد نے اپنی امی سے کہا۔ ''امی مجھے سائیکل لے کر دے دیں۔ پلیز!'' ''اچھا بیٹا جب پہلی تاریخ کو آپ کے ابو کو تنخواہ ملے گی تو میں آپ کو سائیکل لے دوں گی۔'' احمد نے سنا اور اپنا ہوم ورک کرنے چلا گیا۔ اب تو حانیہ روز اسکول جلدی چلی جاتی، جب کہ احمد میاں ہمیشہ ہی لیٹ آتے۔

''تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟'' احمد نے حانیہ کے ہاتھ میں بہت سارے پیسے دیکھ کر پوچھا۔ ''اور تم ان پیسوں کا کیا کرو گی؟'' ''بھیا! میں ان پیسوں سے اپنے لیے ایک خوب صورت سا فراک لوں گی۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں امی کو کہنے کے بجائے خود ہی پیسے اکٹھے کر کے فراک لے لوں۔'' ''مگر تم نے یہ پیسے اکٹھے کیسے کیے؟'' احمد نے حانیہ سے پوچھا۔ ''بھیا! پہلے ہم روزانہ اسکول لیٹ جاتے تھے اور پھر لیٹ جانے پر 20,20 روپے جرمانہ بھی دیتے تھے۔ پھر میں نے سوچا کیوں نہ میں اسکول وقت پر جایا کروں اور اس طرح میں روزانہ 20 روپے بچا لیا کروں گی۔ بس پھر کیا تھا میں نے پیسے جمع کرنے شروع کر دیے اور اب میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں ان سے ایک فراک لے سکوں۔ حانیہ تو چلی گئی مگر احمد سوچ میں پڑ گیا کہ حانیہ اگر اپنی فراک کے لیے پیسے جمع کر سکتی ہے تو میں پیسے جمع کر کے نئی سائیکل بھی نہیں لے سکتا۔

اگلی صبح احمد اسکول جلدی سے پہنچ گیا اور اس نے وہ 20 روپے جو وہ جرمانہ دیتا تھا آج گولک میں ڈال دیے۔ آج احمد کو واقعی لگ رہا تھا کہ وہ اگر روزانہ 20 روپے جمع کرتا رہا تو وہ ایک دن واقعی اپنی سائیکل لے سکے گا۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

اب پچھتائے کیا ہوت

احمد حسام الدین، لاہور

وہ ایک سرد رات تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ کئی دنوں سے فاقے سے تھا۔ وہ اپنے غرور اور بے پرواہی پر پچھتا رہا تھا۔ مزمل ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ماں باپ نے اسے دنیا بھر کی ہر نعمت سے نوازا تھا۔ وہ کوئی چیز بولتا تو وہ پلک جھپکتے میں اس کے سامنے لا کر رکھ دی جاتی۔ ہلکا سا پیٹ درد یا کھانسی بھی آ جاتی تو ماں باپ کی جان پر بن جاتی۔ اسی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا۔ اس کے اندر غرور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کے خوشامدی دوست دن رات اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے اور اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے اس کی دولت ہڑپ کرتے رہتے۔ مزمل کے ماں باپ اس سے بہت پریشان تھے۔ وہ اسے دن رات سمجھاتے رہتے وقت ضائع کرنے والوں کی اس دنیا میں کبھی عزت نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس کو شہر کے سب سے معیاری اسکول میں داخل کروایا تھا لیکن اس کی بدتمیزیوں اور لگاتار فیل ہونے کے سبب اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اب مزمل جس اسکول میں بھی جاتا اسے وہاں سے نکال دیا جاتا۔ اس کی ماں اسے سمجھاتی رہتی کہ پڑھنے کی طرف توجہ دو لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ اسی طرح آوارہ گردیاں کرتا رہا۔ ایک دن اس کے والد کی طبیعت بری طرح سے خراب ہو گئی۔ ان کا بہت علاج کروایا لیکن ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ ایک دن اس کے والد اس دنیا سے چلے گئے۔ ان کے علاج پر پہلے ہی بہت پیسہ خرچ ہو چکا تھا لیکن مزمل کو اب بھی ہوش نہ آئی۔ مزمل کی ماں سوچتی رہتی کہ اب وہ اپنا اور مزمل کا پیٹ کیسے بھرے گی۔ اسی فکر میں گھلتے گھلتے ان کی طبیعت بھی حد سے زیادہ بگڑ گئی اور وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اب مزمل کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے پاس مدد مانگنے گیا لیکن کسی نے اسے پناہ نہ دی۔ کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ اب مزمل کافی دنوں سے فاقے سے تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے اپنی ماں کی نصیحتوں کو سن لیا ہوتا۔ ان پر عمل کیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا تھا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

انعام

محمد دانیال، لاہور

چودہ اگست کی آمد آمد تھی۔ احمد کو شدت سے اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے ابو جان اس کے لیے ایک بڑا سا سبز ہلالی پرچم لائیں گے۔ جب ایسا نہ ہوا تو ایک دن اس نے ابو جان سے پوچھ ہی لیا۔ ''ابو! آپ جھنڈا کب لائیں گے، محلے میں میرے دوستوں نے جھنڈے خرید بھی لیے ہیں۔'' جب دفتر سے تنخواہ ملے گی تو میں اس دن گھر آتے ہوئے جھنڈا لے آؤں گا۔'' ابو جان نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کب دفتر سے تنخواہ ملے گی؟'' احمد نے پوچھا۔ ''بہت جلد، اچھا اب سو جاؤ۔'' ابو جان کے کہنے پر احمد نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا مگر ابو جان کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اتوار کو ملتان سے چچا جان آئے تو انہوں نے احمد کو پچاس روپے دیئے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اب وہ آسانی سے جھنڈا خرید سکتا تھا۔ شام کے وقت وہ بازار گیا۔ وہاں دکان پر سبز ہلالی پرچم اور خوب صورت جھنڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک لڑکے نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں صبح سے بھوکا ہوں، میری مدد کریں۔'' ''تم کہاں رہتے ہو؟'' احمد نے پوچھا۔ ''ریلوے لائن کے ساتھ کچی آبادی میں ہمارا گھر ہے، میرے والد پچھلے سال ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے تھے۔ والدہ بیمار ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کر سکتیں، میں صبح سے کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر مجھے کوئی کام نہیں ملا۔'' یہ کہتے ہوئے لڑکا زار و قطار رونے لگا۔ احمد کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے ایک نظر لہراتے ہوئے پرچموں کو دیکھا اور پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے نکالے اور اس لڑکے کو دے دیئے۔ لڑکے کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ احمد جب خالی ہاتھ گھر پہنچا تو ابو جان اس کے منتظر تھے۔ ابو جان کے پوچھنے پر احمد نے انہیں ساری بات بتا دی۔ ''احمد! تم نے بہت اچھا کیا ہے، کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے۔ دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' یہ کہہ کر ابو جان کمرے سے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لائے تو احمد کے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔ ''مجھے آج ہی تنخواہ ملی ہے اسی لیے تو تمہارے لیے پیارا سا پاکستان کا جھنڈا لایا ہوں۔'' ابو جان بولے۔ پیارے وطن کا جھنڈا پا کر احمد کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک غریب لڑکے کی مدد کرنے کا اسے انعام دیا ہو۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

تعلیم و تربیت کا شمارہ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے تپتے صحرا میں پیاس کی شدت سے نڈھال چلتے ہوئے بندے کو ٹھنڈا پانی مل جائے اور اس میں جان پڑ جائے۔ یہ سمجھ نہیں آتا کہ تعلیم و تربیت کی تعریف کن الفاظ میں اور کیسے کریں۔ اس کی تعریف سے ہم عاجز ہیں۔ میری مصوری کو سراہنے کا بہت بہت شکریہ۔ 14 اگست کو میری سال گرہ بھی ہے۔ ہم نے تعلیم و تربیت جیسا زبردست رسالہ نہیں دیکھا۔ آپ خطوط کے جواب بھی بہت زبردست دیتی ہیں۔ ہم نے بہت سی زبردست تحریریں ارسال کی ہیں لیکن ردی کی ٹوکری کا ہاضمہ بھی بہت زبردست ہے، جو زبردست چیزوں کو بھی زبردست طریقے سے ہضم کر جاتی ہے۔ اگر آپ نے ہمارا یہ زبردست خط شائع نہ کیا تو ہم آپ سے زبردست طریقے سے ناراض ہو جائیں گے۔ آخر میں ایک شعر:

کون لا سکتا ہے ہمارے خطوط میں کمی
ہم قلم سے نہیں حوصلوں سے لکھا کرتے ہیں

(بشریٰ حسینی، کلورکوٹ)

☆ آپ کا زبردست خط ردی کی ٹوکری ہضم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا خوش ہو جائیے۔

2017ء کا تعلیم و تربیت انقلابی رنگ سے سجے ہوئے ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ میں ایسے بامقصد اور معیاری رسالے کو صرف وقت گزاری کا ذریعہ ہرگز نہیں سمجھتی کہ رسالہ جلدی جلدی ہضم کیا اور اگلے شمارے کا انتظار شروع۔ میں ہر تحریر، ہر کہانی سے کچھ سمجھنے کی، غور و فکر کی اور عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ادارے کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ''تعلیم و تربیت'' ہے۔ اس رسالے کو ہم تک پہنچانے کے لیے آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو سلام ہے اس محنت پر۔ یہ رسالہ دن بدن شان دار سے شان دار ہوتا جا رہا ہے۔ حمد و نعت پڑھیں، روح سرشار ہو گئی۔ دل و جان کو معطر کرنے والا یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ وادی کاغان کے بارے میں روشناس کروانے کا بہت شکریہ۔ تمام کہانیاں ہی دل چسپ اور لاجواب تھیں۔ تعلیم و تربیت اتنا حسین ہے کہ لوگوں تو چھوڑیں رنگ و بو کے قافلے بھی اس پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ میرے میٹرک میں بہت اچھے نمبر آئے ہیں۔

(حفصہ اعجاز، صوابی)

☆ حفصہ، تبصرے کا شکریہ۔ اچھے نمبروں کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔

میں نے یہ رسالہ آٹھویں جماعت سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ ہمارے گھر کے سب افراد اس رسالے کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں پہلی بار اس میں شرکت کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ پوری دنیا میں ترقی کرے گا۔ آپ میرا یہ خط ضرور شائع کیجیے۔ میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے بہت ہی ڈر لگتا ہے۔ پلیز میرے خط کو ردی کی ٹوکری میں مت پھینکیں۔ تعلیم و تربیت ایک معلوماتی رسالہ ہے۔ تعلیم و تربیت کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ مجھے ہر ماہ تعلیم و تربیت کا انتظار رہتا ہے۔ پلیز یہ میرا پہلا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ اگر میرا یہ خط شائع ہوا تو میں بہت خوش ہوں گی۔ اللہ کرے تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین! ثم آمین۔

(نور فاطمہ، خانیوال)

☆ خط حاضر ہے۔ ردی کی ٹوکری لگتا ہے آپ سے ڈر گئی ہے۔

آپی میں آپ سے بہت ناراض ہوں پچھلے تین مہینوں سے میں خط لکھ رہی ہوں اور میرا خط ہمیشہ ردی بی بی کے پاس چلا جاتا ہے کبھی تو اسے بھی ایڈیٹر کی ڈاک میں جگہ دے دیں۔ یہ خط بہت زیادہ امید سے لکھ رہی ہوں۔ ارے ارے پھینکیں تو مت پڑھ تو لیں۔ تعلیم و تربیت کی کیا بات کی جائے؟ واہ۔ سپرہٹ رسالہ ہے پوری دنیا میں۔ تعلیم و تربیت کی تعریف اور آپ سب کی محنت کو سراہنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ جولائی کا شمارہ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ ہم سب بہن بھائی اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ضرب المثل کہانی اور کھوج لگایئے بہت اچھے سلسلے ہیں بلکہ پورا رسالہ ہی بہت اچھا ہے اب اس امید کے ساتھ خط ختم کرتے ہیں کہ یہ خط ضرور شائع ہوگا۔

تیری تعریف کا کیا کریں حساب
تجھے پڑھنے کو ہے ہمارا دل بہت بے تاب

☆ تعریف بہت ہوگئی۔ دیگر سلسلوں میں بھی حصہ لیں۔ (زارا خان، میانوالی)

سب سے پہلے تو میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ اتنا عرصہ غیر حاضر رہی۔ آج کافی مہینوں بعد خط لکھ رہی ہوں۔ کہیں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟ وہ اصل میں میرے انٹر کے امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لیے حاضر نہیں ہو سکی لیکن رسالہ ضرور پڑھتی ہوں میں۔ اب ذرا رسالے کی بات ہو جائے۔ باقی بھی ساری کہانیاں ہمیشہ کی طرح اچھی اور سبق سکھانے والی ہیں۔ آخر میں آپ سب کو میری طرف سے آزادی مبارک ہو۔ اگست میں میری سال گرہ بھی ہے۔ میں نے اتنے عرصے بعد خط لکھا ہے۔ ضرور شائع کیجئے گا۔ اللہ تعلیم و تربیت کو ایسے ہی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین) (عدن سجاد، جھنگ صدر)

☆ جی ہاں! ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔ ارے نہیں! یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ سے ناراض ہوں۔ بس اداس ہو جاتے ہیں۔ آپ کی غیر حاضری سے۔ سال گرہ مبارک ہو۔

مجھے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ کوئی بھی کہانی ملتی تو فارغ وقت میں پڑھ لیا کرتی تھی۔ اس بار مجھے آپ کا تعلیم و تربیت کا رسالہ ملا۔ اس میں تمام کہانیاں بہت اچھی ہیں خاص کر ”قسم سے“ اور سب سے زیادہ ”الٹا نگر کے موٹو شاہ“۔ میں پہلی بار یہ خط لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی اسے ضرور شائع کیجئے گا۔ تعلیم و تربیت کے لیے ایک شعر عرض ہے۔

رسالہ تعلیم و تربیت ہی لانا
اس میں چھپا ہے تعلیم کا خزانہ

(نور صفیہ اشفاق، لاہور)

تو ہم آپی آ گئے سر پہ پیر رکھ کے۔ سب کو میری طرف سے سلام اور خاص کر ردی کی ٹوکری کو جس نے پچھلے مہینے بھی میری خط کو کچپ کے ساتھ ہڑپ کر لیا۔ وہ تو شکر ہے کہ صرف نام بچ گیا جو آپی نے شائع کر لیا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ میں نے 13 بار خط بھیجا لیکن صرف ایک بار ہی شائع ہوا۔ لگتا ہے ردی کی ٹوکری کو صرف میرے خط کا انتظار ہوتا ہے۔ خیر اس بار ضرور شائع کرنا۔ دعا کرتا ہوں کہ ردی کی ٹوکری کا کچپ ختم ہو گیا ہو۔ اب آتے ہیں رسالے کی طرف۔ اس بار بھی رسالہ بہترین تھا۔ سب دوستوں، بہن بھائیوں اور تعلیم و تربیت کے قاریوں کو میرا اسلام۔

خط لکھا، خط بھیجا لیکن شائع نہیں ہوا
کبھی تو شائع ہو گا اسی امید پہ لکھتے ہیں

☆ ٹھیک کہا۔ امید پہ دنیا قائم ہے۔ (محمد عرفان آفریدی، جمرود)

میں آپ کو دوسری بار خط لکھ رہا ہوں۔ البتہ پہلی مرتبہ میرا خط آپ نے شائع ہی نہیں کیا۔ پلیز میرا یہ خط ضرور شائع کیجئے گا۔ میں تعلیم و تربیت کو ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ جولائی کا شمارہ سپرہٹ ہے۔ تمام سلسلے بہت اچھے تھے خاص طور پر ”ویران جزیرے کا راز“ کی قسط کا مجھے بے صبری سے انتظار تھا۔ میں نے تمام ”اوجھل خاکے“ بھی تلاش کر لیے ہیں۔ میں نے ”میری زندگی کے مقاصد“ میں بھی حصہ لیا ہے۔ پلیز میری تصویر اور مقصد ضرور شائع کیجئے گا۔ مجھے اگست کے شمارے کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ اگر میرا خط شائع ہو گیا تو مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ نہیں ہے اس سے کوئی اچھا رسالہ، نام ہے جس کا ”تعلیم و تربیت“ اس کو پڑھنے سے ملتی ہے میرے دل کو تقویت۔ (دانیال سخاوت، راول پنڈی)

جولائی کے شمارے نے تو عید کی خوشیوں کو بھی دوبالا کر دیا۔ ”میری بیاض سے“ تو مجھے بہت ہی پسند آیا اور باقی تمام کہانیاں بھی سپر ڈوپر ہٹ تھیں۔ میں 2014ء سے تعلیم و تربیت کا مستقل قاری ہوں لیکن خط پہلی مرتبہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی ہو گی۔ میں نے پچھلے ماہ کہانی بھیجی تھی لیکن شائع نہیں ہوئی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور پھر بھیج رہا ہوں۔ اب ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

پھول تو بہت سے ہیں لیکن گلاب جیسا کوئی نہیں
رسالے تو بہت سے ہیں لیکن تعلیم و تربیت جیسا کوئی نہیں

☆ کہانی معیاری ہوئی تو ضرور شائع ہو گی، انتظار کیجئے۔ (محمد بلال، لاہور کینٹ)

☆ اقراء ظفر، وجھیانوالہ آپ نے میری اتنی تعریف کر دی ہے کہ مارے شرمندگی کے خط کا متن شائع نہیں کیا لہٰذا جواب حاضر ہے۔ آپ کی محبتوں کا شکریہ، نوازش!!!

جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں:

نادیہ رفیق، وجھیانوالہ۔ ماریہ اعظم، قلعہ دیدار سنگھ۔ عبدالمھیمن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ زویا رفاقت، عائزہ وحید، بھمبھر۔ منیبہ محمد افضل، انیسہ محمد افضل، گوجرانوالہ۔ وردہ ایوب، سعدیہ عروج، میمونہ نوید، راول پنڈی۔ محمد سلیمان، سلیمان شکور، قصور۔ لائبہ قدیر، محمد زبیر جمشید، جہانیاں۔ عدینہ نور، سیال کوٹ۔ سیمل سکینہ، مظفر گڑھ۔ محمد ذیشان، فیصل آباد۔ ثانیہ اظہر، انس امین، نمرہ، رضوان، محمد ولید، لاہور۔ عباد الرحمٰن، مانسہرہ۔ زنیرہ بانو کمالیہ۔ غزالہ حبیب، تاندانوالا۔ نسرین عالم، ساہی وال۔ محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا۔

فرہاج کافی دیر سے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ سہ پہر ہونے کو تھی اور اب تک وہ صرف چار چڑیاں ہی پکڑ سکا تھا۔ چڑیاں پکڑنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، وہ ہر روز دوپہر کو بانسی تیلیوں والا پنجرہ صحن میں لا رکھتا، اس کے اوپر لگی ہک میں ایک مضبوط سی ڈوری باندھتا اور ڈوری کا آخری سرا پکڑ کر پنجرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ جاتا، ڈوری کو اس طرح سے کھینچ کر رکھتا کہ پنجرے کا اگلا آدھا حصہ زمین سے اوپر کو اٹھ جاتا، عین پنجرے کے نیچے وہ باجرہ یا روٹی کے ٹکڑے بکھیر دیتا، جونہی کوئی چڑیا دانہ چگنے کے لیے پنجرے کے نیچے بے خیالی میں جاتی، فرہاج بڑی آہستگی لیکن پھرتی سے ہاتھ میں پکڑی ڈوری کو ڈھیلا چھوڑ دیتا اور یوں بیچاری چڑیا پنجرے کے نیچے دب کر چوں چوں کرنے لگتی۔ فرہاج جلدی سے چڑیا کو احتیاط سے پکڑ کر دوسرے پنجرے میں قید کر لیتا۔ حالاں کہ اس حرکت پر اسے بارہا ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی لیکن یہ شرارت وہ اس وقت کرتا جب دوپہر کو سب آرام کر رہے ہوتے، خاص طور پر وہ اپنے پنجرے کو سمی سے بچا کر رکھتا تھا، جو موقع غنیمت جانتے ہی پنجرے کا دروازہ کھول دیتا تھا اور چڑیاں پھُر کر کے اڑ جاتی تھیں۔

سمی کی عمر چھ سال تھی وہ اگرچہ فرحاج سے پورے پانچ سال چھوٹا تھا لیکن اپنی بات یوں رعب سے منواتا کہ جیسے وہ فرہاج سے بڑا ہو۔ یوں بھی سمی سب کی آنکھوں کا تارا تھا، خصوصاً جب وہ فرہاج کی پکڑی ہوئی چڑیاں اڑا دیتا تو سب گھر والے اسے خوب شاباش دیتے۔ فرہاج کو اس کی یہ حرکت اگرچہ بہت کھلتی (بُری لگتی) تھی لیکن کیا کرتا...... صبر کے گھونٹ پینے پڑتے، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سمی کی ہر بات چھوٹے بھائیوں کی طرح مان لیتا تھا۔

چند ہی دنوں میں اس نے پچیس (۲۵) چڑیاں پکڑ لیں اور اس مرتبہ یہ کام اس لیے بھی زیادہ زور و شور سے کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے وعدہ کر چکا تھا کہ یوم آزادی پر وہ ایک پارٹی کا اہتمام کرے گا، جس میں وہ اپنے ہاتھ سے شکار کی ہوئی چڑیوں کا قورمہ پکائے گا اور یوں سب دوست مل کر نہ صرف ہلا گلا کریں گے، بلکہ دعوت بھی اڑائیں گے۔

فرہاج کی خواہش تھی کہ وہ اس مرتبہ انوکھے طریقے سے آزادی کا جشن منائے، لہٰذا اس کے ذہن میں یہی ایک ترکیب سمائی اور اس نے اپنے دوستوں کو آزادی کا جشن منانے کے لیے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ جشن آزادی میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور وہ جلد از جلد مزید چڑیوں کو پکڑنا چاہتا تھا تاکہ بھرپور طریقے سے دعوت اڑائی جا سکے۔

اس دعوت کے بارے میں صرف اس کے دوستوں کو ہی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس بارے میں گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو خیر نہیں اور اگر وقت سے پہلے سمی کو علم ہو گیا تو بس قیامت ہی آ

جائے گی۔ سمی کا خیال آتے ہی اس نے اٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور پنجرہ اٹھا کر برآمدے کی آخری نکڑ پر چھپا کر رکھ دیا۔

''حاجی بھیا! کہاں ہو؟ سمی جانے کس لمحے آنکھیں ملتا ہوا اس تک آ پہنچا۔ وہ عموماً فرہاج کو صرف حاجی یا حاجی بھیا ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ فرہاج اسے اچانک اپنے قریب پا کر دم بخود رہ گیا۔

''ارے...... چھوٹے بھائی...... تم۔'' فرہاج نے چہرے پر مصنوعی ہنسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''حاجی بھیا! میرے ساتھ بابو کی دکان تک چلو، میں نے کلر پنسلیں خریدنی ہیں۔'' سمی نے نہایت معصومیت سے کہا۔

''ابھی تو پچھلے ہفتے میں نے لا کر دی تھیں۔'' فرہاج نے کہا۔

''حاجی بھیا! جشن آزادی کے لیے میں خود جھنڈیاں بنا رہا ہوں، کاغذ امی جان نے کاٹ کر دیا ہے اور سبز رنگ میں خود بھر رہا ہوں، کمرے میں آ کر تو دیکھو۔'' سمی نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہا...... اسی اثناء میں دونوں بھائی ردا، حمزہ، ماہا اور ہنی کی آوازوں پر چونک گئے گویا شام ہوتے ہی فوجیں حملہ آور ہو گئی ہیں۔ سمی کو بھی کھٹک گئی کہ اب فرہاج اس کے ساتھ جانے کا نہیں۔ اس سے پہلے کہ فرہاج کوئی معذرت کرتا، سمی اسے گھورتا ہوا واپس اندر چلا گیا۔ حمزہ اور ہنی بھی سمی کی ناراضگی بھانپ چکے تھے۔ ''سمی ہمیں کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھ رہا تھا؟'' حمزہ نے فرہاج سے آہستگی سے پوچھا۔

''ارے بھئی چھوڑو اسے...... تم سب سناؤ۔ تیاریاں مکمل ہیں نا......۔'' فرہاج نے کسی لیڈر کے سے انداز میں پوچھا...... اور پھر باری باری سب نے جشن آزادی کی تیاریوں کے بارے میں تفصیل بتانا شروع کر دی۔

''ہمارے لیے چوں چوں کا مربہ کب تیار ہو گا؟'' ننھی ماہا نے جھٹ سے کہا۔ ''چوں چوں کا مربہ؟'' سب نے حیرانی سے کہا۔

فرہاج سمجھ گیا تھا کہ ماہا بھول رہی ہے کہ چوں چوں کے مربے کی بجائے ''چوں چوں کا قورمہ'' کھلانے کا وعدہ کیا گیا تھا، لہٰذا اس نے سب ساتھیوں کو مزید یقین دلایا کہ جشن آزادی کے موقع پر ''چڑا پارٹی'' میں چوں چوں کا قورمہ ضرور تیار کیا جائے گا۔

''لیکن پکائے گا کون؟'' ردا نے اپنی ٹماٹر جیسی گال پر انگلی ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ امی، ابو اور سمی جشن آزادی کی صبح انکل طارق کے ہاں مبارک باد کے لیے جائیں گے، اس دوران سارا باورچی خانہ ہمارے قبضے میں ہو گا اور کھانوں کی ترکیب والی کتاب پہلے سے ہی کچن میں پڑی ہے۔''

فرہاج نے انہیں اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔ لیکن ایک اور خاص بات...... چڑیوں کو ذبح کون کرے گا؟ اس سوال پر واقعی سب پریشان ہو گئے۔ اس جانب تو کسی کی بھی توجہ نہیں گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو سب ہی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، لیکن اچانک فرہاج کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''دوستو! یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ مالی بابا بہت اچھے ہیں اور میرا کہا کبھی نہیں ٹالتے لیکن اس بات کا تذکرہ پہلے نہیں کروں گا، کہیں وہ ابو کو نہ بتا دیں، تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اور اپنے گھروں

کو جاؤ، جشن آزادی کے دن ٹھیک ساڑھے بارہ بجے آ جانا، سمجھے۔"

فرہاج کے سب دوست خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور بڑی بے تابی سے آزادی کے دن کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے جشن آزادی کا دن بھی آ پہنچا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی فرہاج کی امی اور ابو انکل طارق کے ہاں آزادی کی مبارک باد دینے کے لیے چل دیئے اگرچہ انہوں نے سمی اور فرہاج کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ فرہاج نے تو دوستوں کی آمد کا بہانہ بنا لیا، جبکہ سمی محض اس ضد میں نہیں گیا کہ اگرچہ فرہاج بھیا نہیں جائیں گے تو وہ بھی نہیں جائے گا۔ یوں دونوں بھائی گھر پر ہی رہے۔

سمی کی گھر میں موجودگی فرہاج کو کھٹکنے لگی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بنا بنایا کھیل ہی نہ بگڑ جائے۔ ابھی تو اسے مالی بابا سے بھی بات کرنی تھی۔ سمی باغیچے میں لگے ننھے ننھے پودوں پر جھنڈیاں اٹکانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے بڑی محنت سے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں۔ فرہاج نے موقع غنیمت جانا اور سٹور کی جانب چل دیا تاکہ ذبح کرنے سے پہلے چڑیوں کو دانہ پانی کھلا دیا جائے۔ نیلے پروں والی چڑیاں تھیں کہ پھدک پھدک کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فرہاج کو دیکھتے ہی چوں چوں کا واویلا اس طرح کرنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ خدا کے لیے ہمیں رہا کر دو لیکن فرہاج مسکرا دیتا، بلکہ کبھی کبھی تو ان کے بے پناہ شور پر انہیں سختی سے ڈانٹ بھی دیتا۔

اس وقت بھی سب چڑیاں پنجرے کی تیلیوں کے ساتھ اپنے پنجے گاڑھے حیران حیران باہر دیکھ رہی تھیں۔ فرہاج نے پنجرے میں رکھی پیالیوں میں پانی اور باجرہ ڈالا اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی حرکات و سکنات سے محظوظ ہونے لگا۔ سمی بھی اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ادھر آ نکلا اور ضد کرنے لگا کہ اس کے ساتھ مل کر کمرے میں جھنڈیاں لگائے لیکن فرہاج کو تو ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ صبح کے دس بج چکے تھے۔ گرمی بھی زور دکھانے لگی تھی۔ فرہاج کے ٹال مٹول کرنے پر سمی کی تو غصے کی انتہا نہ رہی اور وہ پیر پٹختا کمرے سے نکل گیا۔

فرہاج کو یوں لگا کہ جیسے سمی سٹور کا دروازہ باہر سے بند کر گیا ہو۔ اس نے جھٹ اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا، لیکن واقعی سمی غصے میں دروازے کی چٹخنی چڑھا گیا تھا۔ اب تو فرہاج کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے زور زور سے سمی کو آوازیں دینا شروع کیں لیکن کوئی جواب نہ پا کر اس کو تشویش ہونے لگی۔ اس نے سوچا شاید پانچ دس منٹ کے بعد سمی کا غصہ ٹھنڈا ہونے پر خود ہی دروازہ کھول دے، لیکن کچھ دیر گزرنے پر بھی جب دروازہ نہ کھلا تو اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی دیکھی جو ساڑھے دس بجا رہی تھی۔

پورے دو گھنٹے بعد پوری پلٹن بھی یہاں پہنچ جائے گی۔ ابھی کتنے ہی کام کرنے ہیں اور الو، سمی، شیطان...... "اور نہ جانے کیا کیا وہ دل میں اسے برا بھلا کہنے لگا۔ اس وقت اسے اپنی بے بسی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ بھلا سمی کی بات مان لینے میں ہرج بھی کیا تھا۔ میں نے خواہ مخواہ جھنڈیاں لگانے سے انکار کیا۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب تھا اور پچھتا رہا تھا۔ وہ جب دروازہ کھٹکھٹاتا تو چڑیوں کی چوں چوں میں اور بھی اضافہ ہونے لگتا۔ گھر میں کوئی اور فرد ہوتا تو اسے اس مشکل سے نجات دلا دیتا۔ مالی بابا بھی یقیناً اپنے کوارٹر میں ہوں گے، ورنہ آواز سن کر ہی دوڑے آتے۔

اب کیا کروں! وہ سوچ سوچ کے ہلکان ہو رہا تھا۔ "آج تو میں امی ابو سے اس بدتمیزی کی شکایت ضرور کروں گا۔ مجھے یہاں قید کر کے خود جانے کہاں دفعان ہو گیا ہے۔" فرہاج روہانسا ہو چکا تھا۔

پیاس کے مارے اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ آج تو "چڑیا پارٹی" کی خوشی میں اس نے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اسے بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ آخر بے بس ہو کر وہ چڑیوں کے پنجرے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"اچھی چڑیو! دعا کرو کہ سمی جلدی آ جائے اور مجھے اس قید سے رہا کرے۔" فرہاج نے بڑی لجاجت سے چڑیوں سے کہا جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ چڑیوں کو تو اپنی چوں چوں سے ہی فرصت نہیں تھی کہ کون سا لمحہ ہو جب پنجرے کا دروازہ کھلے اور وہ آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔ فرہاج کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یوں لگنے لگا کہ جیسے وہ بھی ان چڑیوں کے ساتھ کمرہ نما پنجرے میں قید ہے، چوں چوں کا واویلا کر رہا ہے اور سمی اس کی بے بسی پر مسکرا رہا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر اس کے ہاتھ میں دکھنے لگے تھے، لیکن سمی کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کمرے میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو گھر کے پچھواڑے سے کھلتی تھی۔ فرہاج نے کھڑکی کھول کر بھی آوازیں دیں، لیکن یوں لگ رہا تھا کہ اس کی آواز کسی تک بھی نہیں پہنچ رہی۔ اگر کمرہ تیسری منزل پر نہ ہوتا تو اب تک وہ یقیناً چھلانگ لگا چکا ہوتا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا...... آخر تھک کر پھر پنجرے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چڑیوں سے باتیں کرنے لگا۔

’’پیاری چڑیو! دیکھو آج میں بھی تمہاری طرح قید میں ہوں، سمی بہت ظالم بچہ ہے...... مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے تنگ کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب باتیں میں ان مظلوم چڑیوں سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ معاً (فوراً) اسے خیال آیا۔

’’میں بھی تو ظالم ہوں، ان چڑیوں کو ہمیشہ تنگ کرتا رہتا ہوں، نہ صرف قید میں رکھتا ہوں بلکہ ابھی انہیں ذبح بھی کرنا تھا۔ اف میرے خدا! کتنا بڑا ظلم ہو جانا تھا مجھ سے، مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں ان ننھی جانوں کو قید کر کے انہیں کس قدر پریشان کرتا ہوں۔‘‘

فرہاج کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ نادم سا پنجرے کے پاس بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں باہر چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ ماہا، ردا، ہنی اور حمزہ اندر داخل ہوئے اور فرہاج کو دیکھتے ہی سب کے چہرے کھل گئے۔

ارے بھئی! ابھی تم چڑیوں کے پنجرے کے پاس ہی بیٹھے ہو؟ حمزہ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اور بھوک سے ہمارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ ہنی نے مزید مرچ مصالحہ لگایا۔ سمی سہما سہما ایک طرف کھڑا تھا کہ آج چٹخنی لگانے والی شرارت پر بھائی سے ضرور مار پڑے گی لیکن فرہاج سمی کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

’’تم سب میرے ساتھ آؤ۔‘‘ فرہاج نے پنجرہ اٹھاتے ہوئے سب کو صحن کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرہاج کیا کرنے والا ہے؟ فرہاج نے چڑیوں کا پنجرہ صحن میں رکھا اور آہستگی سے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چڑیاں ایسی پھرتی سے پنجرے سے ہوا ہوئیں کہ سب بچوں کے منہ کھلے کے کھلے ہی رہ گئے۔ فرہاج کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔ اب چڑیوں کی چوں چوں اسے واویلا نہیں لگ رہی تھی بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی ہوں، اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ اسے بھی جشن آزادی کی مبارک دے رہی ہوں۔

’’بہت خوب، شاباش بیٹا۔‘‘ بچوں نے چونک کر پیچھے دیکھا، جہاں فرہاج اور سمی کی امی ابو کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

’’فرہاج بیٹے نے جس انوکھے انداز سے جشن آزادی منایا ہے، ہم اس خوشی میں آپ سب بچوں کو ’’چوں چوں کا قورمہ‘‘ کھلانے کی بجائے ’’ککڑوں کوں قورمہ‘‘ کھلائیں گے۔‘‘ فرہاج کے ابو نے فرہاج کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ہرے...... انکل زندہ باد...... جشن آزادی زندہ باد...... سب بچے خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

☆☆☆

بہت مہینے گزر گئے ہمیں اس منحوس آدمی کی قید میں آہ ہمیں کوئی خریدار ابھی تک خریدنے نہیں آیا نجانے کس وقت اور کب ہماری رہائی ہو گی اور ہم دوبارہ سے آزاد فضاؤں میں پرواز کریں گے۔ کاش ہم بیساکھی کے دنوں میں کھلیانوں میں مکئی کے دانے چننے، کھیتوں میں نہ اترتے اور آج یہ دن نہ دیکھتے۔ ہریالے طوطے نے بال اُڑے ٹنڈ منڈ طوطے کے ساتھ دکھ کی کہانی دہراتے ہوئے کہا۔ جواب میں گنجے طوطے نے کہا۔ ”ارے تم اکیلے ہی تو نہیں قید ہوئے تمہارے ساتھ ہمارے چار اور ساتھی پیلو، گیتو، ٹمیالا اور رنگیلا بھی تو قید ہوئے ہیں، وہ تو بے چارے اتنی آہیں نہیں بھرتے، صبر شکر کیے وقت گزار ہی رہے ہیں نا، اس لیے یار! ہریالے تم بھی صبر کرو۔ باقی سب نے بھی ٹیں ٹیں کر کے ہاں میں ہاں ملائی اور ٹمیالے طوطے کے کہنے پر سب نے اللہ پاک کے حضور دعا مانگی کہ ہمیں آزادی عطا کر دے۔ یاالٰہی، آمین! ٹیں ٹیں ٹیں سب نے مل کر بولا اور اتنے میں منور طوطے والا جس کے ساتھی ان کو کھیتوں سے پکڑ کر لائے تھے، جس کا ایک بازو کسی حادثے میں کٹ چکا تھا، آگے بڑھا اور اپنی دکان کے باہر پڑے پنجرے، جن میں جا بجا کبوتر، کبوتریاں اور طرح طرح کے طوطے تھے اٹھا اٹھا کر اپنی چھوٹی سی ڈربہ نما دکان میں رکھنے لگا۔ کیوں کہ شام ہونے کو تھی اس کی گاہکی حسب معمول جاری رہی تھی مگر کبھی کبھار کی طرح آج اتنا سودا نہ بکا تھا جتنا وہ چاہتا تھا منور تالا لگا کر گھر کو روانہ ہو گیا۔

کال کوٹھڑی جیسے ڈربے نما کمرے میں شور وغل کی آوازیں بلند ہو گئیں، پنجروں میں قید کبوتر، کبوتریاں اپنی آوازیں نکال کر غوں غوں غڑغوں غڑغوں اور بین نما آوازیں۔ ٹیں ٹیں ہر طرف طوطوں کی چیخ و پکار شروع تھی۔ ہریالہ طوطا اتنا رویا کہ آنسو ٹپک ٹپک کر گردن گیلی ہو گئی۔ ٹمیالا طوطا اپنے دوست لالو طوطے کی یاد میں ایسی آہیں بھرنے لگا کہ باقی طوطوں کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اسی طرح گنجا اور پیلو بھی اپنی کھلی پروازوں کو یاد کرنے لگے اور اسی طرح آدھی رات بیت گئی۔ اچانک باہر سے کتوں کے بھونکنے اور بلیوں کے میاؤں میاؤں چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ تمام طوطے کونے کھدرے میں جا لگے۔ کچھ نے اپنے پنجے پنجروں کی آہنی سلاخوں کے ساتھ جما کر خود کو گرنے سے محفوظ کر لیا۔ سارے دن کے بھوکے پیاسے پنچھی خوف کے مارے اپنے سوکھے حلق لیے حالات سے نمٹنے کی سعی میں تھے کہ دیکھو اب کیا ہونے والا ہے مگر کتے بھونکتے بھانکتے، غرّاتے، شور مچاتے بھوبھوں اور نتھنے پھلا کر سونگھتے سونگھتے پرندوں کی بو۔ کچھ نہ پا کر اور طرف چل دیئے۔

رنگیلا طوطا سارے طوطوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''دوستو اپنی گھٹن، کالی رات اور بدبودار پنجرے یہ تو ہماری زندگی نہ تھی۔ آزادیاں کہاں گئیں، ڈال ڈال گھومنا، پھل دار درختوں کے سایوں میں آرام کرنا مست ہو کر جھولنا اور پھل کترنا اور پھر یوں ہی اپنے غول کے ہمراہ اڑ جانا۔ اے دوستو! یہ انسان اب انسان نہیں رہا، آدمی ہے اور آدمی ہمیں قید میں رکھ کر اپنی خوشی کے سودے کرتا ہے۔ کتنی بے حسی کا مقام ہے کہ خود آزاد ہے اور پرندہ غلام، وہ بھی بے دام غلام ہے خود جو چاہتا کھاتا پیتا جہاں چاہے چلتا پھرتا ہے اور ہمیں اندھیری کوٹھڑی میں رکھتا ہے، جہاں سانس بھر ہوا بھی کھل کر میسر نہیں یہ کیسا انسان ہے جس کی تعریف اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ نے تو ہمیں آزاد پیدا کیا اور اس حضرت انسان نے ہمیں قید کر کے ہمیں تکلیف دی۔ کیا اسے خوف خدا ذرا نہیں۔ اسے اپنی آخرت کی فکر نہیں۔ یہ کیا حساب دینے سے بے پرواہ ہے، باقی تمام نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہنے لگے کہ ایک دن آزادی کا ضرور آئے گا، یہ تو ظالم ہے مگر اللہ کریم مظلوموں کی فریاد ضرور سنتا ہے۔ گنجے طوطے نے کہا۔ ''میں نے اپنے ابو جی سے سنا ہے کہ دادا جی کہتے تھے جو ہمارے تمام طوطوں کے سردار تھے۔ مظلوم کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ ہمیں بھی امید رکھنی چاہیے۔ مانا کہ ہم اس کے دام میں پھنس چکے ہیں لیکن ہمیں مل کر دعائیں مانگتے رہنا ہے اور امید کی روشنی میں ہی جینا ہے تاکہ ہماری ہمت، عزم اور حوصلہ ماند نہ پڑ جائے آؤ پھر دعا مانگیں اللہ کریم بہت مہربان ہے، وہی ہمارا خالق، مالک اور رزق دینے والا ہے۔ سب طوطوں نے مل کر بولا۔'' آمین۔'' اتنی دیر میں صبح ہونے والی ہوگئی۔ یہ وہی صبح تھی جو طلوع ہوتے ہوئے ان کی دعاؤں کی قبولیت لیے ہوئے تھی کیوں کہ سحری کے وقت کی پکار اللہ کریم پسند فرماتا ہے۔

منور نے بھی حسب معمول نو بجے اپنی دکان کھولی۔ پنجرے باہر نکال کر رکھے تاکہ لوگ اپنے بچوں کو دل بہلانے کے لیے پرندے خرید کر دیں۔ آمد ورفت حسب معمول جاری ہونے لگی۔ سڑک پر رکشے، موٹر سائیکل، کاریں، گدھا گاڑیاں اور سائیکلیں رواں دواں ہوگئیں۔ ہر دکان دار اپنی دکان چمکانے لگا۔ گاہکیاں شروع تھیں، ٹھیلے والے، غباروں والے، سموسہ فروش آوازوں پہ آوازیں تیز ہونے لگیں۔ دنیا کا کاروبار پھر سے چمکنے لگا۔ تمام طوطے امید وانتظار میں پھر سے پنجرے کی سلاخوں سے دنیا کے یہ رنگ دیکھ رہے تھے۔

ایک ایسا گھر بھی تھا جہاں مائدہ اپنی امی جان اور بہن آمنہ حفیظ سے آزادی کی باتیں کر رہی تھی کیوں کہ 14 اگست پاکستان کی آزادی کا دن ہے، جب بھارت اور انگریز کے تسلط سے ہم خوش قسمت لوگوں کو آزادی کا دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ مائدہ اپنی بہن آمنہ سے کہنے لگی۔ ''باجی اگر ہم آزاد نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ کیا آج ہم اگر آزاد ہیں تو قائداعظم اور ان کے رفقاء کی کوششوں کے نتیجے میں ورنہ آج کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے آدھی صدی گزر گئی تو کیا ہماری عزتیں، وقار، جان مال سبھی کچھ پامال ہو رہا ہوتا اور بھارتی درندے گھر گھر دندناتے۔ ہمارے دن اور رات خوف اور پریشانیوں میں گزرتے جاتے۔ الحمدللہ ہم آج آزاد قوم اور انسان ہیں۔ آمنہ باجی نے جواب دیا۔ ''ہاں، مائدہ! آزادی تو ایسی نعمت ہے جو خوش قسمت انسانوں ہی کو اللہ تعالیٰ کی عطا سے ملتی ہے پھر اللہ تعالیٰ قائداعظم محمد علی جناح ڈاکٹر علامہ اقبال، محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان، مولانا ظفر علی خان جیسے لوگوں کو چن لیتا ہے۔ مائدہ اور آمنہ دونوں آزادی کی باتیں کرتے کرتے اچانک چونک اٹھیں۔ مائدہ کہنے لگی۔ ''باجی آمنہ! ہم نے تو نیت کی تھی کہ ہم طوطے اڑائیں گے تاکہ وہ بھی آزاد فضاؤں میں سانس لیں اور اللہ کریم ہم لوگوں سے خوش ہو، چلو امی جان سے اجازت لیں اور نزدیک ہی ایک کبوتر فروش کی دکان ہے وہاں پر چلیں۔ دونوں نے امی جان سے اجازت اور روپے لیے اور کالج روڈ پہ واقع سی آئی اے اسٹاف سے تھوڑا آگے کبوتر فروش کی دکان پر پہنچیں، جہاں پنجرے میں تقریباً آٹھ، دس طوطے بھی قید تھے۔ مائدہ نے دکان دار کو اچھا خاصا لیکچر دیا کہ انہیں کیوں قید کرتے ہو، کبھی سوچتے نہیں کہ قید کتنی بڑی مصیبت ہے۔ دکان دار بولا۔ ''یہ ہم کھیتوں، کھلیانوں سے پکڑ کر اس لیے لاتے ہیں کہ دال روٹی چلا سکیں۔'' آمنہ کہنے لگی۔ ''مگر بھائی تم کوئی اور کاروبار بھی تو کر سکتے ہو ضروری ہے کہ انہیں قید کر کے رکھا جائے کبھی ان قیدی پرندوں کی جگہ رکھ کر زندگی کی مصیبتوں کو خود پر آزما کر دیکھو۔ آمنہ دکھ سے بول بول کر چپ ہوئی تو پل دو پل دکان دار کو بھی شرمندگی ہوئی، شاید اس کا ضمیر جاگنے لگا تھا مائدہ

کہنے لگی بھائی ہمیں اب دو طوطے دے دو مگر ہم اپنی پسند کے لیں گے، لمبی لمبی دم والے تاکہ انہیں اُڑنے میں آسانی ہو لیکن ان طوطوں کی قسمت میں آزادی نہیں لکھی تھی طوطے چھوٹی ہی عمر میں پکڑے گئے تھے اور کسی کی دم بڑی ہونے کو تھی، کسی کی ہو رہی تھی۔ دونوں کچھ مایوس ہوئیں اب سوچا کہ سمبڑیال روڈ ڈسکہ پر منور کبوتر فروش کی مشہور دکان ہے وہاں پر چلتے ہیں۔ رکشہ کرائے پر لیا پنجرہ ساتھ ساتھ رکھا اور وہاں جلدی جلدی پہنچ گئیں اور منور کبوتر فروش کی دکان پر ایک بڑا پنجرہ دیکھا جس میں تقریباً دس بارہ طوطے گرمی سے بے حال پنجرے کی جالیوں سے چپٹے تھے۔ مناسب بھاؤ تاؤ کے بعد چوبیس سو میں تین عدد لمبی لمبی دم والے طوطے خرید کر گھر لائیں۔ وہ سبز رنگ کی جالیوں میں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ آمنہ نے پکے پکے امرود بھی اندر رکھے تھے اور مائدہ نے پنجرے کی زمین پہ تازہ تازہ سر سبز گھاس پھیلا رکھی تھی تاکہ طوطے آرام سے بیٹھ سکیں، انہیں جالی چبھ نہ سکے۔ دونوں بہنیں دلی طور پر خوش تھیں اب گھر واپسی ہونی تھی۔ جانے کے وقت پنجرے میں تمام دوسرے طوطے اپنے ساتھی طوطوں کو رخصت کرتے ہوئے نم ناک و غمگین تھے لیکن ابھی ان کی قسمت میں آزادی نہیں لکھی تھی آزاد ہونے والے تین خوش قسمت طوطوں میں گنجا، ہریالہ اور رنگیلا طوطے شامل تھے لیکن ان کو ابھی تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہم آزاد ہونے والے ہیں انہیں تو بس یہ معلوم تھا کہ ہم مٹیالا، پیلو اور گیتو سے بچھڑ کر نجانے اور کس طرح کی ظالم قید میں گرفتار ہونے والے ہیں۔ خیر گھر آ گیا۔ یہ گھر بہت پیارا گھر تھا۔ انہیں دکان دار منور کبوتر فروش کی گھٹن زدہ کوٹھڑی جبس زدہ پنجرے بدبودار ماحول سے تو چھٹکارا ملا۔ اب آگے بھی اللہ مالک تھا۔ امی جان نے طوطے دیکھے تو مسرت سے ان کا خوب صورت چہرہ جگمگا اٹھا۔ انار کے درختوں کے نیچے پنجرے کو مائدہ نے خوب اچھی طرح باندھ کر جھولے کی طرح لٹکا دیا ہر طرف ہریالی دیکھ کر ان کی بھی سانس میں سانس آئی۔ ہلکا سا ٹیں ہوا اور پھر وہ امرود کترنے لگے۔ نجانے کتنے عرصے سے امرود نصیب نہ ہوا تھا۔ بس صرف مکئی کے دانوں پر گزارہ تھا۔ اب صاف ہوا دار گھر دور تک دکھائی دیتا۔ وسیع و عریض آسمان، ہر طرف پھول اپنی بہار دکھاتے ہوئے۔ امید اور دعا میں قبولیت نظر آتی دکھائی دی۔ ''اگر

قید کے وہ دن نہیں رہے تو یہ دن بھی دوستو نہیں رہیں گے۔'' گنجا طوطا پر امید ہو کر بولا۔

ادھر آمنہ نے مائدہ اور امی جان کو مشورہ دیا کہ پہلے تین چار دن ان پرندوں کی خوب خدمت کرتے ہیں انہیں کھلاتے پلاتے ہیں تاکہ یہ ہمیں دعائیں دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں انہیں آزاد کرنے کے صدقے میں ہماری تنگیاں، پریشانیاں، تکلیفیں دنیا و آخرت میں دور فرمائے۔ آمین۔ مائدہ بے چین بے چین سی تھی کہنے لگی تین چار دن انہیں قید میں ضرور رکھنا ہے، انہیں صبح ہوتے ہی آزاد کر دیں گے تاکہ یہ جلد از جلد آزادی جیسی نعمت کا مزا چکھ سکیں۔ سب کا اسی پر اتفاق ہو گیا۔

اگلی صبح اسی طرح روشن تابندہ، شاداں و فرحاں، مسرت و انبساط سے بھری، خوشگوار کرنیں پھیلاتی طلوع ہو چکی تھی جس طرح 14 اگست کو برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی جیسی انمول نعمت اللہ کے کرم اور قائداعظم کی کوششوں سے نصیب ہوئی اور آج تک نصیب ہے۔ تینوں طوطے اپنے محسنوں کے لیے بھی دعا گو تھے جو ان کی رہائی کا وسیلہ بنے، جن کے دل میں اللہ نے رحم ڈالا اور آزادی کا ایسا احساس پیدا کیا کہ وہ کسی کو قید میں نہ ڈال سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے۔ امی جان، مائدہ اور آمنہ بھی اللہ کریم کی شکر گزار تھیں جس نے انہیں اس نیک مقصد کے لیے چنا اور پسند کیا۔ آزادی بڑی انمول اور لازوال نعمت ہے جو صرف خوش قسمتوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آزادی کی حفاظت اور قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 راگست 2017ء ہے۔
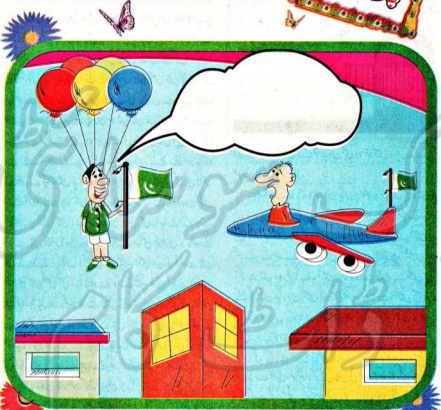
جولائی 2017ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے شام کے بعد بھی چراغ نہ بجھایا جائے (محمد شماس حسین، بہاول پور)
- پہلے یہ تھا بلب دان اب ہوئی ترقی بن گیا شمع دان (سندس آسیہ، کراچی)
- باعثِ لوڈشیڈنگ بہت مشکل پڑھائی ہے
  رکھ کر موم بتی بلب پر روشنی ہم نے بڑھائی ہے (محمد معاذ اکمل آرائیں، کبیر والا)
- میرا شوقِ مطالعہ دیکھ اور میرا انتظام بھی دیکھ (ثمین مقصود، لاہور)
- سپر بلب انوینشن، اب بجلی کے بل کی نو ٹینشن (نمرہ ظہور، ستیانہ بنگلہ)

ہونہار مصور

موسم برسات

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

ملیحہ شہباز، راول پنڈی (پہلا انعام 195 روپے کی کتب)

زبیر جمشید، جہانیاں (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

کشف جاوید، فیصل آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

سمعیہ توقیر، کراچی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

سیدہ تحریم مختار، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ہادیہ خالق، ڈیرہ غازی خان۔ ایمان لطیف، لاہور۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ شگفتہ جمیل احمد، حافظ آباد۔ نجم الصباح ازل، میانوالی۔ شاندانہ یار محمد تنگی، چارسدہ۔ ثانیہ اظہر، لاہور کینٹ۔ زارا خان، میانوالی۔ نادیہ رفیق، خانیوال۔ حسیب خان، اسلام آباد۔ محمد حسنین طوروی، جہلم۔ سیدہ زینب، لاہور۔ باسمہ مشتاق قادری، پنڈیکھیب۔ علیاء وسیم، ڈی جی خان۔ ایمن یار محمد تنگی، چارسدہ۔ نمرہ رضوان، لاہور۔ حسیب احمد، خانیوال۔ امینہ وحید، واہ کینٹ۔ عباد الرحمٰن، مانسہرہ۔ الوینا اشرف، منڈی بہاؤ الدین۔ خنساء حسینی، کلورکوٹ۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ جویریہ خالد، اسلام آباد۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1